خدا رسول(ص) امام اور معاد شناسی

تالیف: اہل قلم کی ایک جماعت
مترجم: نثار احمد زین پوری

اصولِ دین

خدا رسولؐ امام اور معاد
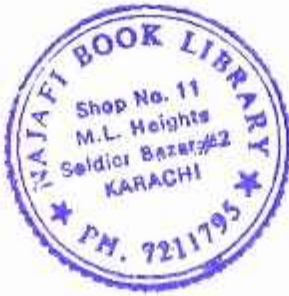
شناسی

تالیف

اہل قلم کی ایک جماعت

مترجم

نثار احمد زین پوری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اصول دین: خدا، رسول، امام اور معاد شناسی / تالیف اہل قلم کی ایک جماعت؛ مترجم نثار احمد زینپوری۔ قم: انصاریان،
۲۰۰۶۔۱۴۲۷ء
۴۰۰ ص۔
ISBN: 964-438-636-1
کتابنامہ بصورت زیرنویس۔
اردو۔
۱۔ اصول دین۔ ۲۔ شیعہ - عقاید۔ الف۔ زینپوری، نثار احمد، مترجم۔ ب۔ عنوان۔
BP ۲۱۱/۵/ ۶الف
۲۹۷/۴۱۷۲

اصول دین ترجمہ اردو

خدا، رسول، امام اور معاد شناسی

تالیف: اہل قلم کی ایک جماعت

مترجم: نثار احمد زین پوری

پبلشر: انصاریان پبلیکیشنز۔ قم

اول طباعت: ۱۳۷۸۔۱۴۱۸۔۱۹۹۸

دوم طباعت: ۱۳۸۳۔۱۴۲۵۔۲۰۰۴

سوم طباعت: ۱۳۸۵۔۱۴۲۷۔۲۰۰۶

چھاپخانہ: ثامن الائمہ۔ قم   تعداد صفحات: ۴۰۰ ص

تعداد: ۲۰۰۰ نسخہ   سائز: mm۲۰۵ X۱۴۳

ISBN: ۹۶۴۔۴۳۸۔۶۳۶۔۱

انصاریان پبلیکیشنز

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۷

قم۔ جمہوری اسلامی ایران

فون نمبر ۷۷۴۱۷۴۴ فیکس نمبر: ۷۷۴۲۶۴۷۔۲۵۱۔۰۰۹۸

Email: ansarian@noornet.net

www.ansariyan.org&www.ansariyan.net

عرض مترجم

سالہا سال سے یہ تمنا تھی کہ ایک مفصل و مستدل کتاب "عقائد" کے موضوع پر اردو میں شائع ہونی چاہیے کیونکہ دیگر موضوعات پر تو بہت سی کتاب طبع ہو چکی ہیں لیکن اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب شائع نہیں ہو سکی ہے جو کہ مختصر ہونے کے ساتھ عقائد کا مکمل دورہ ہو جس کے مطالب عہد حاضر کے تقاضوں اور موجودہ زبان کے پیرایہ میں بیان کئے گئے ہوں، چنانچہ میں نے متعدد کتابوں کا مطالعہ کیا اور دو تین کتابوں کا ترجمہ کیا مگر ان کی زبان سخت، گنجلک اور مطالب فلسفی تھے زیر نظر کتاب کا اسلوب و نگارش نہایت سادہ، با مثال، حالات حاضرہ کی علمی پیش رفت کے مطابق ہے۔

اس کا ترجمہ میں نے تین سال قبل کیا تھا اور اسی وقت کتابت وغیرہ کے مراحل بھی طے ہو گئے تھے مگر کچھ وجوہ کی بنا پر طباعت میں اس سے کہیں زیادہ تاخیر ہو گئی کہ جتنی مجھے جلدی تھی تین سال تک تو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ ترجمہ کہیں محفوظ ہے یا زمانہ کی دستبرد کا شکار ہو گیا۔

چند ماہ قبل محترم جناب محمد تقی انصاریان صاحب کی میز پر دیدہ زیب سرورق کتاب نظر آئی میں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو معلوم ہوا اصول دین ہے، میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا یہ تو میرا ترجمہ ہے مگر جب ورق الٹ پلٹ کر دیکھا تو نہ کہیں ناشر و مطبع اور نہ مترجم کا نام ملا، استفسار کے بعد معلوم ہوا کہ پاکستان میں چھپی ہے، میں نے محترمی انصاریان سے کہا آپ اسے اپنے ادارہ سے شائع
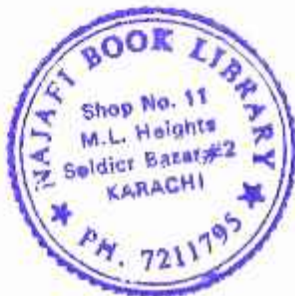
کیجئے' بہت مفید کتاب ہے وہ تیار ہو گئے، لہٰذا میں پریس جانے سے قبل ایک بار از اول تا آخر ترجمہ پر نظر ثانی کی تاکہ ممکنہ حد تک اغلاط کی تصحیح کردی جائے، بحمداللہ نظر ثانی کی منزل بھی طے ہو گئی اور اب طباعت کی منزل ہے،

امید ہے بارگاہ خدا و معصومین علیہم السلام میں درجہ مقبولیت حاصل کرے گی اور ناشر و مترجم کے گناہوں کی بخشش کا باعث ہوگی، اور اردو داں طبقہ بھی خاطر خواہ استفادہ کرے گا،

نثار احمد زین پوری

فہرست

(۳)

نبوّت

(۴)
امامت

۵ معاد

۱ و ۲

توحید و عدل کی بحث

تصوّر کائنات

- تصور کائنات کی قسمیں
- تصور کائنات کا اثر
- مادی و الٰہی تصور کائنات
- خلاصہ
- سوالات

تصوّر کائنات

کائنات اور اپنی تخلیق کے بارے میں انسان جو نظریہ قائم کرتا ہے اسے تصور کائنات کہتے ہیں۔

تصوّر کائنات کی قسمیں

۱۔ مادی تصور کائنات : بعض افراد اپنی فکر کے لحاظ سے مادہ ہی کو وجود قرار دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ کائنات کی تخلیق میں مقصد اور منصوبہ درکار نہیں ہے اور کسی پیدا کرنے والے کی احتیاج نہیں ہے۔ اس گروہ نے کائنات کی جو تفسیر کی ہے اسے مادی تصوّر کائنات کہتے ہیں۔

۲۔ الٰہی تصوّر کائنات : بعض افراد کائنات کے وجود کو با مقصد اور منصوبہ کے تحت سمجھتے ہیں کہ جس کا ہر وقوعہ ہر لحظہ وجود میں لانے والے کا محتاج ہے اور انھیں وجود میں لانے والا بے نیاز خدا ہے وہ پروردگار جو کہ ساری خصوصیات سے منزہ ہے کائنات کے بارے میں ایسے نظریہ کو الٰہی تصوّر کائنات کہتے ہیں۔

تصوّر کائنات کا اثر

کائنات اور اس کے حوادث اور وقوعوں کے بارے میں انسان کی معلومات اور اس کا نظریہ اس کی زندگی اور کردار پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ اگر انسان دنیا کو کھانے اور سونے کی جگہ سمجھے اور روٹی، کپڑا اور مکان ہی اس کا شعار ہو، مادی رفاہ ہی اس کا مقصد ہو اور اس کی نظر میں وہی امور اہمیت کے حامل ہوں جو کہ مقصد کے حصول

یں معاون ہوتے ہیں، مختصر یہ کہ اس کی تمام کوشش و جانفشانی اور جذبات یہاں تک کہ اس کی انسانیت بھی روٹی، کپڑا حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ فردکی انسانی قدر وقیمت کو پرکھنے کا معیار بھی اس کا مقصد ہے جیسا کہ حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

جس شخص کا مقصد پیٹ ہی بھرنا ہے تو اس کی قدر و قیمت پیٹ سے خارج والی چیز کے برابر ہے۔[۱]

اگر انسان دنیا کو رشد و ارتقا اور ہدایت کے لئے اور انسان کامل کے مقام تک رسائی اور پروردگار سے ملاقات کے لئے امتحان گاہ سمجھے گا تو دوسرے مسائل بھی اس کے لئے قیمتی ہو جائیں گے اور اس کی کوشش بھی اسی عالی مقصد میں صرف ہوگی اور اس کی توانائی انھیں امور میں کام آئے گی اس بنا پر دنیا کے بارے میں اس کا نظریہ اور برداشت، بلا واسطہ کردار پر اثر انداز ہوگا۔

مثالی تصور کائنات

جب انسان دنیا کی (خلقت کی) طرف متوجہ ہوگا جس میں وہ زندگی گذارتا ہے تو لامحالہ اس کے وجود کے متعلق کوئی نظریہ قائم کرے گا اور اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ اس تصور کائنات کا براہ راست انسان کے کردار پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے، ضروری ہے کہ ہم ایک مثالی تصور کائنات کو پہچانیں۔ اس مثالی تصور کائنات کا ایک معیار ہونا چاہئے جس سے کائنات کی معرفت حاصل

---

[۱] شرح غرر، ۳۷۷

کی جاتی ہے تاکہ وہ کائنات کو ویسا ہی بتائے جیسی وہ ہے۔ مثالی تصور کائنات کی اہم ترین خصوصیات درج ذیل ہیں :

۱۔ عقلی استدلال و برہان پر استوار ہو۔

۲۔ انسان کی فطرت و سرشت سے ہم آہنگ ہو۔

۳۔ انسان کو امیدوار بنائے اور ذمہ دار ٹھہرائے ۔

کائنات کا مثالی تصوّر کونسا ہے

الٰہی اور مادی تصور کائنات کے درمیان ایک مختصر موازنہ ان کے تفاوت کو واضح کرسکتا ہے ۔ اگرچہ ہم آنے والے درسوں میں مادی تصور کائنات کو تفصیلی طور پر بیان کریں گے لیکن یہاں مادی و الٰہی تصور کائنات کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے دونوں کا ایک سرسری جائزہ لیں گے یہ مثالی تصور کائنات کی معرفت کے سلسلہ میں ہماری مدد کرے گا ۔

الف ۔ مادی تصوّر کائنات

۱۔ مادی تصور کائنات میں کائنات کا آغاز و انجام معین اور واضح نہیں ہے ، اس کی تخلیق میں بھی کوئی مقصد و منصوبہ کارفرما نہیں ہے ۔ اس نظریہ کی رو سے کائنات کے نظم و نسق کو برقرار رکھنے اور کنٹرول کرنے کے لئے کوئی باشعور حاکم موجود نہیں ہے بلکہ کائنات بے شعور مادے کے ٹکراؤ سے وجود میں آئی ہے ۔

۲ ۔ انسان چونکہ مادہ اور معاشرہ کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے اور اپنے

سلسلہ میں اس کا کوئی ارادہ و اختیار نہیں ہے۔ لہٰذا ماضی کے تاریک افق کو اپنا آغاز سمجھتا ہے اور اس وسیع زمین پر اپنے موجود ہونے کا کوئی خاص مقصد نہیں سمجھتا!۔

۲ کائنات کا آغاز و انجام مبہم و تاریک ہے اور ان کے درمیان کوئی روشنی نہیں ہے۔ انسان نے بے مقصد و بلا ارادہ اس بے پناہ تاریکی میں قدم رکھا ہے، وہ مادے سے وجود میں آیا ہے اور پھر مادے ہی میں تبدیل ہو جائے گا، اس کی کوششیں مادے کی سرحدوں سے آگے نہیں بڑھیں گی اور چونکہ اس کی زندگی بے شعور ہے اس لئے تمام کوششیں مادے میں گم ہو جائے گی، مادی فلسفی برینڈ راسل کہتا ہے:

"بشر کچھ اسباب و عوامل کی پیداوار ہے، اس کی خلقت میں کسی تدبیر کا دخل نہیں ہے اور نہ ہی کسی مقصد کے تحت وجود میں آیا ہے، بشر اور اس کی آرزو، ڈر، عشق و عقیدہ بھی مختلف ذرات سے ملکر بنے ہیں...

گذشتہ صدیوں کے تمام کام اور فداکاریاں اور انسانی ذہانت و عقلمندی سے وجود میں آنے والی تمام چیزیں مذموم ہیں کیونکہ وہ نظام ہستی کے ختم ہونے کے ساتھ ختم ہو جائیں گی اور جن عظیم چیزوں کو انسان نے وجود دیا ہے وہ کائنات کی تباہی کے وقت دیر یا سویر کھنڈرات میں تبدیل ہو جائیں گی۔"

ب۔ الٰہی تصور کائنات

۱۔ کائنات کا سرچشمہ مبدأ فیاض ہے اور کائنات بے کار و باطل پیدا نہیں کی گئی ہے[1]۔ بلکہ وہ ایک منظم منصوبہ کے تحت وجود میں آئی ہے اور آشکار

---

[1] وما خلقنا السموات والارض وما بینھما لاعبین دخان/۳۸

مقصد کی طرف گامزن ہے۔ اور کائنات کا پیدا کرنے والا اپنے لامحدود علم کے تحت پوری کائنات پر نظر رکھتا ہے۔

۲۔ اللہ والا انسان خود کو اور کائنات کو خدا کی لامتناہی قدرت و اختیار کا کرشمہ سمجھتا ہے۔ اس انسان کے دوش پر عہد الٰہی کا بھی بار ہے اور یہی خدا کا خلیفہ ہے[2]۔

۳۔ اللہ والا انسان دنیا کو اپنی گذر گاہ سمجھتا ہے کہ جس سے بلند مقصد کے حصول کے لئے گذرتا ہے۔ انسان اس وسیع دنیا میں رہ کر آخرت کا توشہ فراہم کرنا چاہتا ہے تاکہ تقویٰ اور عمل صالح کے توشہ کے ساتھ خدا کی طرف سفر کرے۔ اللہ والا انسان، انتھک کوشش کے تحت ہر اس چیز سے فائدہ اٹھاتا ہے جو اس کے رشد و ارتقا میں معاون ہوتی ہے یہاں تک نعمت و مصیبت کو بھی اپنے ارتقا کا زینہ بنالیتا ہے۔

---

[1] و للہ ملک السموات والارض والی اللہ المصیر (نور/۴۲)

[2] انا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنا ... وحملھا الانسان (احزاب/ ۷۲)

خلاصہ

(۱) انسان اپنی اور کائنات کی تخلیق کے سلسلہ میں جو کلی نتیجہ نکالتا ہے اور نظریہ قائم کرتا ہے اسے تصور کائنات کہا جاتا ہے اس نتیجہ کی دو قسمیں ہیں، مادی و الٰہی۔

(۲) مادی تصور کائنات ہستی کو مادہ کے برابر قرار دیتا ہے اور انسان کے مقصد کو اس مادہ میں محدود قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ نتیجہ میں ایک روز اسی مادہ میں گم ہو جائے گا۔

(۳) الٰہی تصور کائنات کی رو سے کائنات کا سرچشمہ مبداء فیاض ہے اور انسان خدا کا برگزیدہ اور اس کا خلیفہ ہے۔ لہٰذا مادہ انسان کا مقصد نہیں قرار پا سکتا۔ یہ تو ایک گذر گاہ ہے کہ جس سے انسان اپنی منزل مقصود کی طرف، بڑھتا ہے۔

سوالات

(۱) تصور کائنات کی تعریف کیجئے اور اس کی قسمیں بیان کیجئے۔

(۲) مثالی تصور کائنات کی خصوصیات بیان کیجئے۔

(۳) انسان کے کردار پر تصور کائنات کا کیا اثر پڑتا ہے؟

(۴) مادی اور الٰہی نظریات میں کیا فرق ہے؟

(۵) انسان کے بارے میں مادی اور الٰہی نظریات کا نتیجہ بیان کیجئے۔

فطری طریقہ

- انسان میں خدا جوئی کا جذبہ
- ایک گروہ کیوں خدا کا معتقد نہیں ہے ؟
- انسان کی آزاد طبیعت
- خلاصہ
- سوالات

کائنات کا خالق وصانع

یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ کائنات کے بارے میں دو نظریئے ہیں، ایک کائنات کو مادہ جیسا سمجھتا ہے کہ جس کے لئے خالق وصانع کی ضرورت نہیں ہے اور دوسرا کائنات کو مظاہر و وقوعوں کا مجموعہ کہتا ہے جو خالق و صانع کے محتاج ہیں۔ مثالی تصور کائنات کی خصوصیت کو مطمح نظر رکھتے ہوئے ہم یہ دیکھیں گے کہ کونسا نظریہ خصوصیات کا حامل ہے۔

کامل و مثالی تصور کائنات کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ انسان کی فطرت و سرشت سے ہم آہنگ ہو اور اس کی بنیاد عقلی استدلال و برہان پر استوار ہو خدا پرستوں نے اپنے مدعا پر جو دلیلیں پیش کی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں ان میں سے بعض کا تعلق استدلال سے ہے اور بعض انسان کی فطرت سے متعلق ہیں۔ یہاں بعض دلائل کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

فطرت

جن تحرکات اور میلانات کا ریشہ انسان کے وجود میں ہے، انھیں فطرت کہا جاتا ہے جیسے علم دوستی، عدالت خواہی، آزادی طلبی وغیرہ فطرت کے میلانات ہیں۔

۱۔ انسان کی خدا جوئی

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا تصور انسان کے وجود کے ساتھ خمیر ہے خدا شناسی اور اس پر اعتقاد رکھنا کوئی ایسی فکر نہیں ہے جو فکر بشر کے لئے علم، فلسفہ اور استدلال سے گھڑی گئی ہو بلکہ یہ فکر انسان کی ابتدائے حیات ہی سے اس کے ساتھ ہے اور طول تاریخ میں آدمی کے اطمینانِ قلب کے لئے اطمینان بخش رہی ہے۔

ایک گروہ کیوں خدا کو نہیں مانتا ؟

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اگر خدا جوئی فطری ہے اور ایسا رجحان ہے جو انسان کی سرشت میں رچا بسا ہے تو پھر ایک گروہ اس فطری میلان سے کیوں بے بہرہ ہے اور خدا کا اعتقاد کیوں نہیں رکھتا ؟

ہم کہتے ہیں کہ فطری خدا جوئی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ تمام انسانوں میں یکساں طور پر منقسم ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کے وجود میں خمیر کر دی گئی ہے، انسان اس کو روشن و درخشاں بھی کر سکتا ہے اور اس کے صاف چشمہ کو گندہ پانی گدلا بھی کر سکتا ہے۔ عدالت خواہی انسان کے اندر موجود ہے مثلاً عدالت کے اجرا میں کسی شخص کے سامنے اس کے والدین کی محبت آجاتی ہے یا اس کے برعکس کوئی شخص اپنے بیٹے سے بے پناہ محبت رکھتا ہے۔ لیکن اجتماعی نظام کے تحفظ و احترام کے لئے وہ اسے زندہ درگور کرنے کے لئے تیار ہے جو امور بنیادی طور پر انسان کی فطرت میں شامل ہیں ممکن ہے سرکشی اور افراط کی وجہ سے ان میں سے ایک ہی ان کے سرچشمہ کو تاریک کر دے اور ان پر پردہ ڈال دے لیکن یہ میلانات کسی وقت بھی انسان کی فطرت سے جدا نہیں ہو سکتے بلکہ جب بھی ان سے گرد وغبار

صاف ہو جائے اور پردہ ہٹ جائے گا یہ روشن ہو جائیں گے

قرآن کی اصطلاح میں، فرعون کی بادشاہت نے اسے اس فطری آواز پر کان نہیں دھرنے دیئے۔ جب اس نے خود کو گرداب کے منہ میں پایا اور یہ دیکھ لیا کہ وہ پوری بادشاہت و قدرت ان چند بپھری ہوئی موجوں کے مقابلے ہیچ و ناتواں ہے، تو چلایا: میں موسیٰ کے خدا کی خدائی کا اعتراف کرتا ہوں اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پیغمبروں نے اپنی تبلیغ میں ہرگز خدا پرستی پر زور نہیں دیا ہے۔ کیونکہ انسان فطری طور پر خدا پرست تھے اور ہمیشہ کائنات کے مبداء کے اعتقاد میں زندگی گذار رہے تھے۔ لیکن غیر منطقی راہوں پر چلنے اور شیطانی راستوں کا اتباع کرنے کی وجہ سے فطری راہوں سے ہٹ گئے تھے اور خدا کے بارے میں ان کا اعتقاد شرک سے آلودہ ہو گیا تھا، پیغمبر اس لئے آئے تاکہ فطرت بشر میں چھپے ہوئے خزانہ کو ظاہر کریں اور اس کی فطرت کو، جو کہ خدا کی امانت ہے، بارآور کریں اور ہر قسم کے شرک و خرافات سے پاک و صاف ایمان کی طرف اس کی راہنمائی کریں۔

جب اکثر لوگوں نے خدا سے اپنے عہد و پیمان کو ـــ جو توحید و خدا پرستی پر مبنی تھا ـــ توڑ دیا اور اس (خدا) کے حق سے بے خبر ہو گئے اور خدا کا شریک و نظیر ٹھہرانے لگے، شیطانوں نے انھیں خدا کی معرفت سے منحرف کر دیا اور اس کی عبادت سے روک دیا تو خدا نے ان ہی کے درمیان سے پیغمبر مبعوث کئے اور لگاتار بھیجتا رہا۔ تاکہ ان سے فطرت کے عہد و پیمان پورے کرائیں

اور خدا کی فراموش شدہ نعمت کو یاد دلائیں۔[1]

۲۔ انسان کی آزاد طبیعت

انسان کے فطری میلانات میں سے ایک قید و بند سے آزادی اور مطلق خواہی ہے انسان مستقل لامتناہی کمال کی تلاش میں رہتا ہے لیکن اسے حاصل کرنے کے لئے غلط راستے اختیار کر لیتا ہے۔ کیا وہ طاقت اور شہرت طلبی کے بل بوتے پر کسی مقام تک پہنچ سکتا ہے جو اس کے لئے کافی ہو؟ کیا اس نے مال جمع کرنے میں کہیں توقف کیا ہے؟ نہیں۔ وہ تو لامتناہی کی تلاش میں ہے۔ ان ہی محدود و معین امور میں اس کی بھاگ دوڑ اور تگ و دو اس بات کی غماز ہے کہ وہ لامتناہی چیز کا طلبگار ہے اسی اندرونی خواہش کی بنا پر وہ دنیا کے تمام جلوؤں کو لامحدود مقدار میں حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کی خواہش کا آفتاب کسی بھی افق پر غروب نہیں ہوتا بلکہ جتنا زیادہ ملتا ہے اتنا ہی زیادہ اس کی خواہش کا شعلہ بھڑکتا ہے اور بسیار طلبی کا جذبہ بڑھتا جاتا ہے۔

عالم مادہ محدودیت کے تار پود میں جکڑا ہوا ہے اس میں لامحدود کو تلاش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف انسان کی اندرونی فطرت کے لئے خارج میں کچھ ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو کہ انھیں لامتناہی سے باز رکھ سکتی ہیں مثلاً اس کی تشنگی کے لئے خارج میں پانی موجود ہے اور بھوک کے لئے کھانا ہے پس اس

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ اوّل

خواہش کو بھی دیگر خواہشات کی طرح پورا ہونا چاہتے لیکن چونکہ مادی دنیا محدود ہے لہٰذا وہ اس خواہش کو پورا نہیں کر سکتی اس خواہش کو وہی پورا کر سکتا ہے جو خود ہر طرح لامحدود ہو اس بنا پر انسان میں اس خواہش اور میلان کا وجود ہستی مطلق کا پتہ دیتا ہے، ایسا وجود جو لامحدود اور مادی خصوصیات سے پاک و پاکیزہ ہو۔

آدمی کی طینت میں وسعت طلبی کا عشق ہے اور اس کا شعلہ اس کی خلقت کے وقت سے اس کے قلب میں بھڑک رہا ہے ؎

خاک تو آنروز کہ می بیختند ؛ شبنمی از عشق در او ریختند

جس روز تیری خاک چھان رہے تھے اسی روز اس کو عشق کی شبنم سے تر کر رہے تھے۔

اگر یہ خواہش، عشق، شہرت طلبی، ثروت و قدرت کی جمع آوری میں استعمال ہو گی تو دوسری غلط راہ پر گامزن ہو جائے گی اور انسان کی خواہش پوری نہ ہو گی اور اضطراب و خوف اس کو گھیر لے گا۔

جو انسان عرصۂ دراز سے مال و منال اور دنیا کے پر فریب جلوؤں کے پیچھے تھا وہ سخت جستجو کے بعد اور حوصلہ شکن کام میں عمر گذارنے کے بعد خوف و ترس سے دوچار ہوتا ہے۔ اگر وہ خاطر خواہ اور آرام سے زندگی گذارنا چاہتا ہے تو اپنے وجود کی گہرائیوں سے دیگر چیزوں کا قلع قمع کر دے اور اس عشق سے پردے اٹھا دے اور حضرت حق کی کامل عبادت و اطاعت اور خود سپردگی کے ذریعہ اسے منور کر دے۔ مستقل اس منزل سے اس منزل تک راستہ طے کرتا چلا جائے تاکہ ساحل تک سلامت پہنچ جائے اور ہستی مطلق سے جا ملے۔

خلاصہ

۱) خداجوئی ایک فطری احساس ہے کہ جس نے تصور خدا کو طول تاریخ میں انسان کے ساتھ ساتھ رکھا ہے۔

۲) باوجودیکہ خداجوئی تمام انسانوں کی فطرت میں موجود ہے لیکن ممکن ہے مختلف علتوں کی وجہ سے اس پر پردے پڑجائیں یا ظاہری طور پر اس کا نور خاموش ہوجائے۔

۳) انسان کمال مطلق سے عشق کرتا ہے اور یہ بالفعل عشق بالفعل معشوق کے وجود کا پتہ دیتا ہے اور جب تک اسے نہیں پاتا آرام سے نہیں بیٹھتا۔

سوالات

۱) کن راہوں سے خدا تک پہنچا جاسکتا ہے؟

۲) فطرت کیا ہے؟

۳) ایک گروہ کیوں خدا کو نہیں مانتا؟

۴) انسان کی مطلق خواہی کس چیز کی علامت ہے؟

۵) انسان کس طرح اطمینان حاصل کرسکتا ہے؟

فطرت کی راہ سے خداجوئی اور خدایابی

- فطرت کے راستے سے انحراف خدا کو بھلانا
- خلاصہ
- سوالات

خداجوئی اور خدایابی

بالکل اسی طرح جس طرح حیوانات بغیر سکھائے اور راستہ یاد کئے ہوئے پانی اور خوراک تک پہنچتے یا آشیانہ بناتے ہیں، انسان بھی بغیر تعلیم کے دل کے راستہ سے اپنے پیدا کرنے والے کو پہچانتا ہے اور اپنے وجود کے اندر اور روح کی گہرائی میں خدا سے عشق کرتا ہے اور خدا کو پالیتا ہے۔

لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عالم طبیعت پر بھرپور توجہ اور اس سے رابطہ کے باعث اور مادی زندگی میں ڈوب جانے کی وجہ سے یہ خدا سے عشق اور اس سے لگاؤ والی صلاحیت حجاب میں چھپ جاتی ہے اور سخت حالات میں جب انسان کی امید ہر چیز سے منقطع ہوجاتی ہے اس وقت ظاہر ہوتی ہے اور خود کو پہچنواتی ہے۔ انسان ہمیشہ اندرونی یا بیرونی عوامل سے متاثر ہوتا ہے وہ انسان کے رجحانات پر چھاجاتے ہیں۔ لوگوں کا ہر گروہ چند عوامل سے متاثر ہوتا ہے۔ مثلاً حسد، جاہ طلبی، دنیا پرستی، خواہشات نفسانی، انسان کے تمام باطنی خواہشات و میلانات اپنے سے قوی تر میلانات کا اثر قبول کرتے ہیں جب سخت حوادث سے دوچار ہوتا ہے" جیسے شدید بیماری، ڈوبنے کا خطرہ، ہوائی جہاز کے گر پڑنے کا ڈر تمام موجودات سے انسان کی امید ٹوٹ جاتی ہے تو یہ اندرونی شعلہ اور فطری کشش ظاہر ہوتی ہے تو

انسان غیر اختیاری طور پر خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور دعا کے لئے اس کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھا دیتا ہے:

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيباً إِلَيْهِ

(زمر/۸)

"جب بھی انسان کو کوئی رنج پہنچتا ہے تو اپنے پروردگار سے توبہ و انابت کرتا ہے۔"

وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ

(روم/۳۳)

"اور جب لوگوں پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو اپنے رب کی طرف متوجہ ہو کر اس کو پکارنے لگتے ہیں۔"

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِداً أَوْ قَائِماً

(یونس/۱۲)

اور جب انسان کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو اپنے پہلو کے بل بیٹھے ہوا یا کھڑا ہوا ہم کو پکارتا ہے۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کا ارشاد ہے:

اَللّٰهُ هُوَ الَّذِيْ يَتَأَلَّهُ إِلَيْهِ عِنْدَ الْحَوَائِجِ وَالشَّدَائِدِ كُلُّ مَخْلُوْقٍ عِنْدَ انْقِطَاعِ الرَّجَاءِ مِنْ كُلِّ مَنْ دُوْنَهُ وَتَقَطُّعِ الْأَسْبَابِ مِنْ جَمِيْعِ مَنْ سِوَاهُ ....

(بحار الانوار ج ۳/۴۱)

"خدا وہ ہے کہ جس کی طرف نیازمندی اور مشکلات کے وقت لوگ رجوع کرتے ہیں جبکہ تمام وسائل سے ان کی توقع ختم ہو جاتی ہے اور امید ٹوٹ جاتی ہے . . . . "

پھر آپؑ نے اپنی بات کی تائید کے لئے امام صادقؑ کی حدیث بیان کی، ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے خواہش کی کہ کائنات کے خدا کی طرف میری راہنمائی فرمائیں۔ آپؑ نے اس سے دریافت کیا؛ کبھی تم کشتی پر سوار ہوئے ہو؟

جی ہاں ؛

کیا کبھی ایسا اتفاق ہوا ہے کہ کشتی ٹوٹ گئی ہو اور دوسری کشتی بھی تمہیں نجات دینے کے لئے وہاں موجود نہ ہو اور تم نجات یابی کے لئے تیرنا بھی نہ جانتے ہو ؟ (خلاصہ یہ کہ تم تمام ظاہری وسائل سے مایوس ہو گئے ہو)

جی ہاں ؛

اس وقت تمام چیزوں سے تمہاری امید منقطع ہو چکی تھی، کیا اس وقت تمہارا دل کسی کی طرف متوجہ نہیں تھا جو تم کو نجات دلا سکے ؟

کیوں نہیں ، میرے دل میں اس قسم کا احساس تھا !

اس وقت جس ذات کی طرف تم متوجہ تھے وہی خدا ہے ۔

جب انسان اپنے سے ہاتھ اٹھا لے گا اور خود خواہی کے پردے دل سے ہٹ جائیں گے تو خدا کی معرفت حاصل ہو جائے گی ۔

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست
تو خود حجاب خودی حافظا ازمیاں برخیز

"عاشق و معشوق کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہے ای حافظ تم خود اپنے حجاب کو چاک کرو۔"

یہ احساس خدا پرستوں سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ جس شخص کے دل کی آنکھوں سے مال و حکومت اور شہوت کے پردے ہٹ جائیں گے وہ خدا کو پائیگا۔

راہ فطرت سے انحراف (خدا کو فراموش کرنا)

ہم میں سے بہت سوں نے زندگی کے حساس لمحات میں اپنے قلب میں خدا کی طرف اس حالت توجہ کا احساس کیا ہے اور سخت حالات میں خدا کو اپنے دل میں موجود پایا ہے لیکن ان مصیبتوں و مشکلات سے نجات کے بعد پھر مادی زندگی میں غرق ہو گئے اور خدا کو فراموش کر دیا۔

قرآن کریم نے بہت سے موقعوں پر انسان کی توجہ اس نکتہ کی طرف مبذول کرائی ہے اور اس حالت کا تذکرہ کیا ہے کہ جب انسان بیچارگی اور درماندگی کی حالت میں خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن نجات کے بعد خدا کو فراموش کر دیتا ہے اور مشکلات انسان کو اس کی یاد سے غافل کر دیتے ہیں چنانچہ قرآن کریم سرزنش کی کیفیت میں فرماتا ہے:

ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْأَرُونَ ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ

(نحل/۵۳)

"پھر جب تم پر کوئی مصیبت پڑیگی تو تم اسی کے سامنے فریاد کروگے اور جب وہ تم سے تکلیف کو دور کر دے گا تو تم میں سے کچھ لوگ پروردگار کا شریک ٹھہرانے لگیں گے۔"

قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُمْ مِنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُونَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً لَئِنْ أَنْجَانَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۔ قُلِ اللَّهُ يُنَجِّيكُمْ مِنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ أَنْتُمْ تُشْرِكُونَ ۔

انعام / ۶۴ و ۶۳

"اے رسول، ان سے پوچھو کہ تم کو خشک وتری کی تاریکیوں سے کون نجات دیتا ہے، جبکہ تم اسے گڑگڑا کر پکارتے ہو اور کہتے ہو) اگر اس دفعہ وہ ہمیں اس بلا سے بچالے تو ہم اس کے ضرور شکر گذار بندے بن جائیں گے۔

کہہ دیجئے: خدا تمہیں ہر سختی و مشکل سے نجات دیتا ہے پھر بھی تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو۔"

اور ایسے لمحات میں انسان مخلصانہ طور پر خدا کی طرف لو لگاتا ہے اور اسی کو پکارتا ہے اور اسی کو سمجھتا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ امیدیں سب چیزوں سے منقطع ہو جاتی ہیں اور وہ اللہ کے سوا سب سے کٹ جاتا ہے۔ اگر انسان ہمیشہ اس حقیقت کو محسوس کرے کہ وہ عاجز و درماندہ ہے اور مادی وطبیعی اسباب وعلل بیکار ہیں تو وہ اس حقیقت کو محسوس کرے گا کہ لامؤثر

فِی الْوُجُوْدِ اِلَّا اللہ) چشم دل سے خدا کو دیکھ لے گا اور نور حق کی تجلّی اس کی زندگی کو روشن کر دے گی ۔

امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں :

لَنْ تَتَّصِلَ بِالْخَالِقِ حَتّٰی تَنْقَطِعَ عَنِ الْخَلْقِ

(غرر الحکم ، حرف لام / ص ۵۹۱)

جب تک تم مخلوق سے جدا نہ ہو گے خالق کے وصال سے محروم رہو گے ۔

خلاصہ

(۱) آدمی کی فطرت میں عشق خدا رچا بسا ہے لیکن مادہ کی وجہ سے اور مادی زندگی کی جلوہ آرائیوں کے سبب اس کشش پر پردہ پڑ جاتا ہے۔

(۲) سخت حوادث کے وقت انسان کی امیدیں تمام چیزوں سے منقطع ہو جاتی ہیں اور فطرت کی آواز اس کے دل میں گونجنے لگتی ہے اور خدا کو پکارنے لگتا ہے۔

(۳) اگر انسان صفحۂ دل کو دنیا کی محبت سے پاک کر دے اور غیر حق سے جدا ہو جائے تو اس عشق کی روشنی ہمیشہ اس کی زندگی کو روشن رکھے گی۔

سوالات:

(۱) خدا سے انسان کا فطری میلان کیسے فراموش ہو جاتا ہے؟

(۲) سخت حوادث کے وقت انسان خدا کی طرف کیوں متوجہ ہوتا ہے؟

(۳) ان حوادث کے وقت انسان کی کیا حالت ہوتی ہے؟

(۴) قرآن نے انسان کی اس حالت کے بارے میں کیا فرمایا ہے؟

(۵) ہمیشہ خود کو خدا کے سامنے حاضر جاننے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

عقلی طریقہ ۱

- کائنات کی تخلیق
- کائنات حرکت میں ہے
- حرکت کو پیدا کرنے والا
- خلاصہ
- سوالات

کائنات کی تخلیق

کائنات موجودات و مظاہر کا مجموعہ ہے اور پوری کائنات ایک ایسی حقیقت ہے جو اپنے وجود کے لئے ایک پیدا کرنے والے کی محتاج ہے۔
کوئی حادث مستقل طور پر موجود نہیں رہ سکتا بلکہ وہ ہمیشہ پیدا کرنے والے کا محتاج رہتا ہے جیسے، انسان، گھاس، زمین، سورج، چاند اور ستارے
انسان موجودات کو دیکھ کر ان کی علت کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ ان کے وجود کو بغیر علت کے تسلیم نہیں کرتا۔ مثلاً اگر آپ الماری سے کوئی کتاب اٹھائیں اور دیکھیں کہ اس میں رطوبت سرایت کر گئی تو فوراً اسکی علت کی جستجو کریں گے۔
کائنات کا متغیر ہوتے رہنا اس کے حادث ہونے کا پتہ دیتا ہے ہر حرکت، محرک اور تغیر علت سے وجود میں آتا ہے اور ہر موجود میں تغیر و حرکت ہوتی ہے اور یہ علت کی محتاج ہے۔
خدا کی معرفت رکھنے والے اور مادی رجحانات رکھنے والے دونوں ہی اس بات کے قائل ہیں کہ ایک موجود ایسا ہے جو علت سے بے نیاز ہے مادی رجحان رکھنے والے کہتے ہیں کہ مادہ بغیر علت کے وجود میں آیا ہے خدا کے ماننے والے خدا کو علت سے بے نیاز تسلیم کرتے ہیں۔
واضح ہے کہ مادہ علت سے بے نیاز نہیں ہوسکتا، کیونکہ تمام مادی

موجودات میں حادث کی تمام خصوصیات موجود ہیں، مثلاً حرکت، تغیر تجزیہ، ترکیب اور محدودیت تمام موجودات میں پائی جاتی ہے چھوٹے سے ذرہ سے آسمانی عظیم کرات اور وسیع کہکشائیں سب ہی تو زمان و مکان میں محدود ہیں اور ان کا وجود بے شمار شرائط سے وابستہ ہے اور یہ تمام شرائط اس کے وجود پر اثر انداز ہیں۔ کائنات کے موجودات میں سے ایک بھی اپنی جگہ مستقل اور بے نیاز نہیں ہے۔

لیکن اس کائنات کو پیدا کرنے والے خدا، جو کہ حادث نہیں ہے اور اس میں حادث ہونے کے آثار بھی نہیں ہیں، کی علت کے بارے میں جو سوال ہوتا ہے کہ پھر اس کی علت کیا ہے؟ تو یہ بے معنیٰ ہے، کیونکہ علت کا محتاج حادث یا وقوعہ ہوتا ہے لیکن اگر کسی چیز میں وقوعہ اور حادث ہونے کے آثار و علامات نہ ہوں تو اس کے لئے علت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکے گا۔ پس خدا حادث و وقوعہ نہیں ہے بلکہ تمام موجودات کو پیدا کرنے والا ہے اور ہر وقوعہ و تغیر اس کے وجود پر روشن دلیل ہے۔

قرآن کی ایک آیت میں انسانوں کے اسی شیوہ کو اختیار کیا گیا ہے اور پیدا کرنے والے کی طرف راہنمائی کی گئی ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ (آل عمران/۱۹۰)

یقیناً آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن کے آنے جانے میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ :

"هل یکون بناء من غیر بانٍ"

"کیا کوئی عمارت بغیر بنانے والے بن سکتی ہے ؟"

کائنات حرکت میں ہے۔

مادہ حرکت سے لبریز ہے پوری کائنات متحرک ہے۔ ذرّہ کے دل میں جو تب وتاب پوشیدہ ہے اور وسیع کہکشانوں اور ستاروں میں جو گردش مشاہدہ کی جاتی ہے، اس سے لے کر رشد و نمو اور ترو تازگی تک سب میں ایک مستقل اور دائمی حرکت موجود ہے۔

مادہ کے وسیع میدان سے ہٹ کر ہم انسان کی بنائی ہوئی چیزوں کو دیکھتے ہیں اور ان میں حرکت کو تلاش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس وقت تک حرکت میں نہیں آتی ہیں جب تک ان میں ان کی خوراک نہیں پڑ جاتی ایسے ہی بغیر کسی روکنے والے کے رکتی نہیں ہیں جیسے ہوائی جہاز کی پرواز اور موٹر کی دوڑ، مختصر یہ کہ ہر چیز میں ایک انرجی کی ضرورت ہے اس میں انرجی پیدا ہوتی ہے تو اس میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔کیا بغیر ڈیزل کے موٹر چل سکتی ہے ؟ کیا بغیر پٹرول کے ہوائی جہاز پرواز کر سکتا ہے ؟

بے شک بغیر کسی محرک کے کوئی موجود معمولی سی حرکت بھی نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ محرک انرجی کا محتاج ہے جب تک انرجی نہیں ملیگی

حرکت وجود میں نہیں آئے گی۔

حرکت پیدا کرنے والا

ہم کہہ چکے ہیں کہ دنیا کے تمام موجودات دائمی طور پر حرکت میں ہیں اور کوئی حرکت اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتی جب تک انرجی بخش محرک موجود نہ ہو۔ ان باتوں کو سب ہی تسلیم کرتے ہیں۔ ظاہراً ان میں کسی کو شک نہیں ہے۔ اختلاف اس بات میں ہے کہ محرک جو مستقل طور پر کائنات کو متحرک رکھتا ہے اور توان بخش وانرجی کا منبع ہے کیا وہ مادے میں پوشیدہ ہے یا ماورائے مادہ کوئی ہے جو کہ کائنات کو طاقت اور انرجی عطا کرتا ہے؟

کیا مادی دنیا خود کفائی اور بے نیازی کی صلاحیت رکھتی ہے یا محتاج ہے؟ یہیں سے مادی رجحان اور الٰہی نظریہ جدا ہو جاتا ہے۔

مادہ ان تمام تغیرات اور حرکت کو وجود میں نہیں لا سکتا کیونکہ ہر مادی وقوعہ کی حرکت کا سرچشمہ کوئی دوسری چیز ہوتی ہے اگر وہ دوسری چیز بھی مادی وقوعہ ہے تو وہ بھی اپنی حرکت میں کسی دوسری چیز کا محتاج ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے اس کا رشتہ ماورائے طبیعت میں تلاش کیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہر حادث کی حرکت خدا کے اختیار میں ہے۔

خلاصہ

۱) کائنات مادی موجودات کا مجموعہ ہے، انسان موجودات کو دیکھ کر ان کی علت کے بارے میں سوال کرتا ہے اور اس طرح کائنات کے پیدا کرنے والے کا سراغ لگاتا ہے، اس کا پیدا کرنے والا حادث کی خصوصیت سے بری ہے۔

۲) کائنات حرکت سے لبریز ہے اور ہر حرکت انرجی کی محتاج ہے، اس بات کو سب تسلیم کرتے ہیں، اختلاف اس بات میں ہے کہ ہستی کا محرک خود مادہ ہے یا اس کو ماورائے طبیعت میں تلاش کرنا چاہیئے؟

۳) یہ بات صحیح ہے کہ ہر وقوعہ کی حرکت اسی جہان میں مخفی ایک محرک کی محتاج ہے لیکن کل کائنات ایسے محرک کی نیازمند ہے جو کہ خارج سے اسے حرکت وطاقت عطا کرتا ہے۔

سوالات

۱) وقوعہ کیا ہے اور اس کی علامت کیا ہے؟
۲) مادہ کیوں علت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا؟
۳) خدا کے بارے میں علت کا سوال کیوں نہیں کیا جاسکتا؟
۴) مادی کائنات اپنی حرکت کا خود سبب کیوں نہیں بن سکتی؟

عقلی طریقہ ۲

کائنات میں نظم وہم آہنگی

- نظم وہم آہنگی کیا ہے ؟
- ایک منظم مشنری کی خصوصیات
- نظم وہم آہنگی کو وجود میں لانے والا
- خلاصہ
- سوالات

برہانِ نظم

کائنات میں نظم و ہم آہنگی

علم و دانش میں بشری پیش رفت اور صنعت و ٹیکنالوجی میں ترقی سے ہم ہر روز اختراعات اور نئے نئے انکشافات کا مشاہدہ کرتے ہیں، عظیم صنعتی مشینیں کمپیوٹر کا پیچیدہ نظام، غول پیکر ہوائی جہاز، فضائی سیارے اور سیکڑوں باریک و لطیف الیکٹرانک کارخانے ہیں، جیسے ہوائی جہاز کو لے جانے والی کشتیاں، پن ڈوبی اور فضائی کشتیاں۔

اس حیرت انگیز ترقی سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی تعمیر میں نہایت نظم وضبط کا لحاظ رکھا گیا ہے اور سائنس دانوں نے انھیں بہت ہی نازک اور ترقی یافتہ ٹیکنک اور وسیع منصوبہ کے تحت بنایا ہے۔

اب ہم مادی دنیا کا ایک سرسری جائزہ لیں گے۔ آپ اس وسیع و عریض کائنات کے ہر گوشہ پر نظر ڈالئے تو آپ نہایت ہی لطیف نظم و ہم آہنگی کو مشاہدہ کریں گے، جیسے جیسے علمی ترقی ہوتی ہے۔ اسی تناسب سے ہم کائنات کے نئے رموز اور اس کی حیرت انگیز چیزوں سے آشنا ہوتے ہیں اور اسرارِ خلقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

روس کا ایک عظیم کیمسٹری دان، مندلیف، اس کے عناصر کو ایٹمی وزن کے

زیادہ ہو جانے کی اساس پر ترتیب دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ عناصر مخصوص گروہوں کی شکل میں، جدول میں ایک دوسرے کے نزدیک واقع ہیں۔

ان گروہوں میں اتنا واضح نظم و ربط ہے کہ جس سے کچھ ایسے عناصر کا بھی انکشاف ہو گیا جو کہ اس وقت تک منکشف نہیں ہوئے تھے۔

ایٹم کی ساخت کے انکشاف نے یہ ثابت کر دیا کہ تمام ایٹم ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود تین قسموں کے ذرات سے وجود میں آئے ہیں، (۱) "پروٹون" جو کہ مثبت الیکٹرک وزن کے حامل ہیں، (۲) "الیکٹرون" جو کہ منفی الیکٹرک وزن کے حامل ہیں، (۳) نیوٹرون جو کہ الیکٹرک وزن سے خالی ہیں۔ الیکٹرونوں اور پروٹونوں کی تعداد برابر ہوتی ہے، ایٹم کے پروٹون اور نیوٹرون ایک مرکز میں موجود ہیں اور الیکٹرون بے پناہ تیزی کے ساتھ مختلف محوروں پر مرکز کے چاروں طرف گھوم رہے ہیں، الیکٹرونوں اور مرکز کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ واقع ہے اور ایٹم کے زیادہ تر حصہ میں خالی فضا ہے۔ اس سلسلے میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ اگر اس خالی فضا کو ان ایٹموں میں سے نکال لیا جائے جو کہ انسان کے بدن کو تشکیل دیتے ہیں تو انسان کا بدن اتنا چھوٹا ہو جائے گا کہ ذرہ بین ہی سے دیکھا جا سکے گا۔ جبکہ اس کے وزن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔

تقریباً زمین کا ۳/۴ حصہ پانی میں ڈوبا ہوا ہے، حالات و حرارت پر اس کا بہت گہرا اثر ہے۔ اگر پانی میں وہ کیمیائی خواص ہوتے جو کہ مندلیف کے ــــ مرتب کردہ جدول میں بیان ہوئے ہیں تو فضا کی تبدیلیاں

زمین آسمان کا فرق ہوتا، پانی کا ملکولی وزن ۱۸ ہے، یہ معمولی دباؤ اور حرارت میں گیس بن جاتا۔ امیونک کا ملکولی وزن ۱۷ ہے اور ۳۳ سینٹی گریڈ درجۂ حرارت صفر سے نیچے ہونے کی صورت میں بھاپ بن جاتا ہے جبکہ پانی ایک مدت دراز تک سیال ہی رہتا ہے اور درجۂ حرارت بہت اوپر چلے جانے سے بھاپ بن جاتا ہے اگر پانی زمین کے حرارتی تغیرات کا مقابلہ نہ کرتا تو زمین پر سکونت نہیں کی جاسکتی تھی، اجسام کے درمیان صرف پانی ہی ایسا جسم ہے کہ انجماد کی صورت میں جس کا وزن گھٹ جاتا ہے اور اس کی خاصیت کا موجودات کی حیات پر بہت گہرا اثر ہے۔ اگر ندیوں اور دریاؤں کی تہوں میں برف اتر جاتی تو رفتہ رفتہ دریا برف سے پٹ جاتے اور ٹیلوں کی صورت میں بدل جاتے، لیکن برف اس کے برخلاف سطح آب ہی پر رہتی ہے اور دبیز ہو جانے کی وجہ سے پانی کو منجمد ہونے سے بچاتی ہے اس طرح دریائی جانور اپنی زندگی کو جاری رکھتے ہیں۔

اگر زمین کا حجم چاند کے برابر چھوٹا ہوتا اور اس (زمین) کا قطر بھی موجودہ قطر کے ۱/۴ ہوتا تو قوت جاذبہ آب و ہوا کو زمین پر محفوظ رکھنے کے لئے کافی نہ ہوتی اور درجہ حرارت مہلک حد تک اوپر چلا جاتا۔ اگر ہماری زمین حجم میں سورج کے برابر ہوتی اور اپنے مخصوص وزن کو محفوظ رکھتی تو قوت جاذبہ ۱۵۰ گنا ہو جاتی اور اس صورت میں پانی کا بھاپ میں تبدیل ہو جانا غیر ممکن ہوتا، اسی طرح ایک کلو گرام وزن کا جانور ۱۵۰ کلو گرام کا ہو جاتا اور آدمی کا بدن گلہری (سنجاب) کے برابر ہو جاتا۔

نظم کیا ہے ؟

نظم عبارت ہے مختلف اجزاء کے اس طرح ایک جگہ جمع ہونے سے کر ان کا ہم آہنگ تعاون ایک حقیقی مقصد کو پورا کرے ، جیسے ایک کیمرہ کے بٹن کو دبانے سے ڈیا فرام کافی وسیع ہوجاتا ہے اور نور کی شعاعیں صفحہ سے گزر کر ریل پر پڑتی ہیں اور اس طرح ایک تصویر ریل پر ابھر آتی ہے (یہاں مختلف چیزوں نے ہم آہنگی سے کام انجام دیا اور مقصد پورا ہوگیا)

ایک منظم مشنری کی خصوصیات

۱۔ اجزاء کی جنس و نوع : اجزاء مختلف جنس و نوع وجود میں آتے ہیں تاکہ ایک ایسا مخصوص کام انجام دیں جو تناسب کا حامل ہو۔ جیسے ایک فوٹوگرافی کیمرہ کا شفاف محدب شیشہ کہ جس کا کام نور کو گزارنا ہے ۔

۲۔ اجزاء کی شکل و صورت : اجزاء کی شکل ایسی ہو جو تمام اجزاء سے ہم آہنگ ہو مثلاً فوٹوگرافی کیمرہ میں محدب شیشہ ہے کہ جس کا کام نور کی شعاعوں کو ریل پر جمع کرنا ہے ۔

۳۔ اجزاء کی مقدار : ہر جزء کی مقدار معین ہے جیساکہ کیمرہ میں ڈیا فرام کی حد معین اور منظم ہے ۔

۴۔ موقع محل : ہر جزء کی مخصوص جگہ ہے چنانچہ اگر اس میں کچھ فرق آجاتا ہے تو منظم مشنری بے کار ہو جاتی ہے مثلاً اگر آنکھیں پیر کے تلوے یا پیشانی کے اوپر ہوتیں تو دیکھنا ناممکن تھا۔

۵۔ **وقت اور زمانہ :** کسی کام کے وقت مختلف اجزاء کا تعاون بھی ایک ہی وقت ہونا چاہئے۔ جیسے موٹر گاڑی کی عقبی سرخ لائٹ کے روشن ہونے کا وقت رفتار کی سستی کے وقت ہے تاکہ پیچھے آنے والے ڈرائیور کو متوجہ کیا جاسکے۔ ماں کے پستان بچے کی ولادت کے وقت دودھ سے پر ہوتے ہیں۔

نظم و ہم آہنگی کا سبب

کائنات کے نظم ونسق کو سب ہی قبول کرتے ہیں۔ لیکن اختلاف اس بات میں ہے کہ یہ نظم خود بخود وجود میں آیا ہے یا اسے کسی باشعور ناظم نے وجود بخشا ہے؟ منظم وقوعوں میں غور کرنے سے یہ نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے کہ یہ نظم ونسق ایک پروگرام کے تحت وجود میں آیا ہے، بیان شدہ مثالوں کو ایک مرتبہ سوچئے اور مادہ کی حیرت انگیزیوں کا اچھی طرح مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کوئی منظم کام کسی شعور وآگہی کے بغیر وجود میں نہیں آتا ہے۔

کیا آپ اس بات کو تسلیم کر سکتے ہیں کہ ایک بے شعور بچے کے ٹائپ رائٹر کے بٹنوں کے دبانے سے اتفاقی طور پر ایک ایسی چیز وجود میں آجاتی ہے کہ جس کا شمار نظام شمسی کے عمیق ترین مسائل میں ہوتا ہے؟ یا اس بات کو قبول کر سکتے ہیں کہ ایک پریس دھات کے مختلف و پراگندہ حروف سے زمین پر ایک ادبی شاہکار کو ثبت کردیتی ہے؟

اب آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ چند صفحات پر مشتمل ایک مقالہ یا ایک مثنوی

مثلاً "کیمرہ" کسی باشعور بنانے والے کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا تو عقل سلیم اس بات کو کیسے قبول کر سکتی ہے کہ یہ عظیم کائنات بغیر کسی باشعور بنانے والے کے وجود میں آگئی ہے؟ اگر ایک خلیہ، یا پتہ کے نظم کا تجزیہ و تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا نظم وضبط اور کمپیوٹر کا نظم ونسق ہرگز قابل موازنہ نہیں ہے۔

اجزاء کی خاصیت وہم آہنگی

ممکن ہے کوئی سادہ لوح انسان یہ تصور کرے کہ نظم وضبط کا وجود میں آنا تو اجزاء کی خاصیت ہے، اس کا یہ خیال خام ہے۔ کسی بھی مجموعے کے ہم آہنگ نظام کو اس کے اجزاء کی خاصیت نہیں قرار دیا جاسکتا کیونکہ اجزاء کے انتخاب اور اس کی مقدار اور نظم ونسق کے ساتھ ساتھ انھیں ایک جگہ جمع کرنے کے لئے بھی ایک باشعور عالم کی ضرورت ہے اسی طرح ہر ایک کو مناسب جگہ پر رکھنا بھی باشعور عالم ہی کا کام ہے۔

خلاصہ

(۱) مختلف اجزاء کا ایک جگہ جمع ہونا کہ جس سے ان میں تعاون وہم آہنگی پیدا ہو اور وہ ایک حقیقی مقصد کو پورا کرنے لگیں تو اس کیفیت کو نظم کہتے ہیں ۔

(۲) کائنات میں نظم وہم آہنگی کو سبھی قبول کرتے ہیں، اختلاف اس بات میں ہے کہ اس نظم کا وجود میں لانے والا کوئی باشعور ہے یا اتفاقی طور سے وجود میں آگیا ہے ؟

(۳) منظم وقوعوں میں غور کرنے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ شعور وآگہی کے بغیر کبھی کسی چیز میں نظم پیدا نہیں ہو سکتا ۔

سوالات

(۱) نظم کیا ہے ؟
(۲) ایک منظم مشنری کی خصوصیات بتائیے ۔
(۳) نظم کو مادہ کیوں نہیں پیدا کر سکتا ہے ؟
(۴) کیا حادثہ نظم کو وجود میں لا سکتا ہے ؟

- توحید اور شرک
- توحید پر دلیلیں
  ۱- کائنات کا ہم آہنگ نظام
  ۲- وجود خدا دوئی کا حامل نہیں
- خلاصہ
- سوالات

توحید

یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ کائنات گوناگوں موجودات کا مجموعہ ہے جو کہ عالم و قادر ذات کے ذریعہ وجود میں آیا ہے اس کا خالق ایک حادث کی خصوصیات سے مبرہ و منزہ ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان اس خالق کے بارے میں اتنا ہی آگے بڑھ سکتا ہے کہ اس کی اصل ہستی سے آگاہ ہو جائے اور یہ جان لے کہ کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا ہے۔ یا اس سے آگے بھی بڑھ سکتا ہے اور خالق کائنات کو اچھی طرح پہچان سکتا ہے؟

توحید اور شرک

بہت سے مکاتب اور مذاہب میں کائنات کو پیدا کرنے والے بے نظیر خدا کا اعتقاد پایا جاتا ہے جیسے وہ خالقیت میں بے نظیر ہے اس جیسا کوئی نہیں ہے۔ لیکن ان کی یہ فکر غالباً شرک کے گوناگوں افکار سے متاثر ہو چکی ہے، انہوں نے اپنی توحیدی اعلیٰ قدروں کو گنوا دیا ہے۔ تحریف شدہ ادیان میں خالق کو یکتا ماننا، عبادت میں شرک، غیر خدا سے مدد طلب کرنا اور باطل خداؤں کی حمد و ستائش کے منافی نہیں ہے۔

اصل توحید کے سلسلہ میں اسلام نے کامل ترین عنوان سے الٰہی تصور کائنات

پیش کیا ہے۔ توحید یعنی خدا کو ایک جاننا اور خالق کائنات کو خلق و آفرینش، تدبیر کائنات اور عبادت و پرستش کے لحاظ سے یکتا سمجھنا۔

توحید پر دلیلیں

خدا کی وحدانیت و یگانگت کا دو طریقے سے جائزہ لینا چاہیئے۔

۱۔ خدا اس معنی میں واحد و یگانہ ہے کہ اس کا کوئی ہمسر و نظیر نہیں ہے۔

۲۔ خدا کسی چیز سے مل کر نہیں بنا ہے اور مختلف قسم کے اجزاء کا مرکب ہے۔

جو موجود اجزاء سے تشکیل پاتا ہے وہ اپنے ہی اجزار کا محتاج ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرکب ہونا وتوعد کی علامت ہے اور خداوند عالم محتاج نہیں ہے۔ پس اس کا وجود بھی مرکب نہیں ہے۔ نہ خداوند عالم کے وجود میں دوئی ہے اور نہ اس کے ذات وصفات میں تغایر ہے۔ کیونکہ اگر اس کے صفات میں ہم آہنگی نہیں ہوگی یعنی ایک نہیں ہوں گے تو خداوند عالم ذات وصفات سے مرکب قرار پائے گا۔ اور مرکب ہونا محتاج ہونے کے مساوات ہے۔ اور خداوند عالم بے نیاز ہے۔ پس اس کے ذات وصفات میں مغایر نہیں ہے۔

۱۔ کائنات کا ہم آہنگ نظام

اس سے پہلے ہم کائنات کے موجودات کے نظم و ارتباط کے بارے میں بحث کر چکے ہیں۔ اب ہم کائنات کے کل موجودات کے درمیان ایک قسم کی لطیف و منظم ہم آہنگی و ہمکاری کو بیان کریں گے، جو کہ کائنات کے

نظام کی غماز ہے، دنیا کے تمام موجودات آپس میں ہم آہنگ ہیں۔ علم و دانش کے ارتقاء سے انسان نے موجودات کے درمیان ارتباط و ہم آہنگی کو کشف کیا ہے۔

کائنات کے تمام موجودات کیمیائی نکتہ نظر سے یکساں ہیں اور روئے زمین پر بیشتر موجود عناصر ایسے ہیں کہ جن کا وجود بعض دوسرے سیاروں پر بھی ثابت ہو چکا ہے۔ یہاں تک کہ نگاہوں سے بہت دور ستاروں کی دنیا میں بھی ان عناصر کا وجود پایا جاتا ہے جو روئے زمین پر موجود ہیں اور جو قوانین روئے زمین پر نافذ ہیں وہ ستاروں سے آگے کہکشانوں پر بھی حکمراں ہیں۔

اس کے بعد مختلف حادث، موجودات اور اپنے بارے میں غور کیجیے اور ان کے درمیان تعاون و ہم آہنگی کو تلاش کیجیے۔ کیا آپ زندہ موجودات اور غذاؤں، کھانے پینے کی چیزوں کے درمیان ہم آہنگی محسوس نہیں کرتے؟ تمام موجودات اپنی حیات کو باقی رکھنے کے لئے پانی وآکسیجن کے محتاج ہیں آفتاب کی حرارت، دریا کے نمکین پانی کو بخارات میں تبدیل کرتی ہے، ہوائیں، میٹھے اور خوشگوار پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو خشکیوں کی طرف لے جاتی ہیں اور بارش سے تمام زندہ موجودات کو مالا مال کرتی ہیں۔ گھاس، سورج کی روشنی اور زہریلی ہوا کو جذب کرتی ہے۔ اور موجودات کو آکسیجن اور غذائی اشیاء فراہم کرتی ہے۔ گھاس بھی مردہ زمینوں میں رشد نہیں کر سکتی بلکہ زندہ، خاک کی محتاج ہے۔ دوسری طرف زندہ خاک کو بیس فیصد ننھے ننھے جراثیم، گھاس اور حیوان تشکیل دیتے ہیں۔

اور ہر گرام زمین پر ملیونوں جاندار زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ ننھے ننھے موجودات جو کہ ذرہ بین سے دیکھے جا سکتے ہیں تجزیہ کے ذریعہ پودوں کے لئے غذا بناتے ہیں۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کائنات کے مختلف موجودات کے درمیان ہم آہنگی موجود ہے اور مساوی طور پر ایک نظام حکم فرما ہے۔ یہ ایسی اتحاد دنیا کے فرمانروا کی وحدانیت اور پیدا کرنے والے کی یگانگت پر روشن دلیل ہے۔

وجود خدا دوئی کا حامل نہیں

خدا کی یکتائی کے ثبوت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اسے ہم صحیح معنوں میں پہچانیں۔ اور لفظ خدا کے صحیح معنی ذہن میں رکھیں۔ اگر اس کلمہ کے حقیقی اور واقعی معنی کو ہم سمجھ لیں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اگر خدا ہے تو ایک ہے دو چار نہیں ہیں، خدا کے وجود میں تعدد محال ہے۔ اپنی بات کی وضاحت کے لیے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں:

ایک جسم ہے جو کہ اپنے تمام ابعاد، طول و عرض و عمق میں بڑا ہے، اور ہر طرف سے لامتناہی ہے، کیا اس کے ساتھ ایک اور لامتناہی جسم فرض کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! کیونکہ پہلا فرضی جسم تمام فرضی فضاؤں کو پر کر لے گا اور دوسرے جسم کے لئے جگہ باقی نہیں بچے گی۔

اب اس لامتناہیت کو ایک موجود کے بارے میں تصور کیجئے کہ جسم نہیں ہے اور وجود کے لئے جتنی جہتیں فرض کی جا سکتی ہیں ان سب کے لحاظ سے

وہ لامتناہی ہے۔ کیا ایسے ہی دو وجود فرض کئے جا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں، کیونکہ دو فرض کرتے ہیں ان میں سے ایک دوسرے کا غیر ہوگا اور ان میں سے ہر ایک کے لئے کچھ نہ کچھ محدودیت ہوگی اور اس لحاظ سے ان میں ایک بھی لامتناہی نہیں رہے گا اور چونکہ وجود خدا ہر لحاظ سے لامحدود ہے اس لئے اس میں تعدد و دوئیت ناممکن ہے۔

خلاصہ

① اثبات صانع کے بعد توحید کی نوبت آتی ہے، یعنی ہر جہت سے خدا واحد و یگانہ ہے، خلق و آفرینش کے لحاظ سے، کائنات کو چلانے کے اعتبار سے، اور عبادت و پرستش کی نظر سے یکتا ہے

② کائنات میں ہم آہنگی اور ربط اس کے پیدا کرنے والے کے وجود پر واضح دلیل ہے۔

③ چونکہ وجود خدا ہر جہت سے لامحدود ہے اس لئے اس میں تعدد کا پایا جانا محال ہے۔

سوالات

① توحید کیا ہے اور اسے کس اعتبار سے مورد بحث قرار پانا چاہئے؟

② وجودِ خدا کیوں مرکب نہیں ہے؟

③ وجودِ خدا میں تعدد کیوں محال ہے؟

④ کائنات کے حادث موجودات کی ہم آہنگی سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

⑤ کیا کا نظام متعدد خداؤں کی فرمانروائی سے باقی رہ سکتا ہے؟

یکتا پرستی اور یکتا شناسی

- خلق و امر میں توحید
- عبادت میں توحید
- اطاعت میں توحید
- ولایت و محبت میں توحید
- خلاصہ
- سوالات

قرآن میں یکتا پرستی اور یکتا شناسی

گزشتہ بحث سے ہم پر یہ بات واضح ہوگئی کہ کائنات کا خالق ایک ہے، بہت سے ادیان و مذاہب میں کائنات کے پیدا کرنے والے کا اعتقاد پایا جاتا ہے لیکن یہ اعتقاد ان کے درمیان مختلف قسم کے شرک سے آلودہ ہوگیا ہے اور ان مذاہب کے ماننے والے یکتا پرستی سے منحرف ہوگئے ہیں۔

اسلام آسمانی ادیان میں کامل ترین دین ہے کہ جس نے توحید و یکتا پرستی کا عالی تصور پیش کیا ہے۔ قرآن پہلے ہی مرحلہ میں انسان کی توجہ خدا کی یکتائی اور خالق کی وحدانیت کی طرف مبذول کراتا ہے اور اس کی وضاحت کے بعد خلق و امر، یعنی پیدا کرنا اور آسمانوں کی گردش اور کائنات کی تخلیق اور اس کی فرماں روائی، خدا سے مخصوص ہے۔ نتیجہ نکلا کہ عبادت و پرستش بھی اسی سے مخصوص ہے۔

خلق و امر میں توحید

گزشتہ بحث سے یہ حقیقت اچھی طرح روشن ہوگئی کہ کائنات کو پیدا کرنے والا ایک ہے، خلق و امر میں توحید کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا سرچشمہ ایک ہے، ایک ذات سے وجود میں آئی ہے اور وہی اسے چلاتی ہے۔ کائنات کی تخلیق اور آسمان کی گردش خدا سے مخصوص ہے۔

"تمہارا خدا ایک ہے اس مہربان خدا کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے۔ زمین و آسمان کے پیدا کرنے اور رات دن کے آنے جانے اور دریا میں کشتیوں کے چلنے میں کہ جن سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، آسمان سے نازل ہونے والے پانی میں کہ جس سے مردہ زمینیں زندہ ہوجاتی ہیں، اور مختلف قسم کے جانوروں میں، اور ہواؤں کے چلنے میں، زمین و آسمان کے درمیان معلق بادلوں میں غور کرنے والوں کے لئے نشانیاں موجود ہیں۔[۱]"

عبادت میں توحید

قرآن نے تمام چیزوں سے زیادہ عبادت میں توحید و یکتا پرستی پر زور دیا ہے اور اسے خلق و امر میں توحید کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ جب یہ بات عیاں ہوگئی کہ اس کائنات کے ہر امر میں خواہ تخلیق کے لحاظ سے ہو یا اس کی تدبیر و کنٹرول کے اعتبار سے کوئی بھی خدا کا شریک نہیں ہے، یہ سب مخلوق ہیں اور خدا کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں، جب یہ معلوم ہوگیا کہ کائنات کے تمام موجودات، سورج، چاند، ستارے، بادل، ہوا، بارش اور رعد و برق آب و خاک، آگ، انسان اور فرشتے سب ہی اس کے زیر حکم ہیں، پھر ان کے حکم کے تابع ہونا اور خدا کے علاوہ دیگر موجودات کی پرستش کرنا یا ان کی تصوّ

۱؎ بقرہ/۱۶۳ و ۱۶۴

وجسمہ بناناچہ معنی وارد ؟

یاایہا النّاس اعبدوا ربّکم الّذی خلقکم والّذین من قبلکم لعلّکم تتّقون الّذی جعل لکم الارض فراشاً والسماء بناءً وانزل من السّماء ماءً فاخرج بہ من الثمرات رزقا لکم فلا تجعلوا للّٰہ انداداً وانتم تعلمون ۔ (بقرہ / ۲۱ و ۲۲)

"اے لوگو! اپنے اس خدا کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے والوں کو پیدا کیا ہے، ہو سکتا ہے تم متقی بن جاؤ، جس نے تمہارے پیروں کے نیچے زمین بچھائی۔ آسمان کو (چھت) بنایا اور آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعہ میوے تیار کئے تاکہ وہ تمہاری روزی بن جائیں، پس کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھہرانا جبکہ تم جانتے بھی ہو۔"

"اگر عبادت و دعا حاجت روائی کے لئے ہو، تو خدا سے مخصوص ہے کیونکہ کائنات کے کل امور اسی کے ہاتھ میں ہیں اور وہی حاجت پوری کر سکتا ہے۔ (اے رسول) کہدیجئے کیا ہم خدا کے علاوہ ان چیزوں کی عبادت کریں جو نہ ہمیں فائدہ پہنچا سکتی ہیں نہ نقصان ......[۱] "

---

[۱] قل اندعو من دون اللّٰہ مالا ینفعنا و یضرّنا ... (انعام / ۷۱)

اور اگر عبادت رازگوئی اور ایک ناقص موجود کی محبت میں ہو تو بھی عبادت خدا سے مخصوص ہے کیونکہ صرف وہی عشق کے لائق ہے۔

الحمد للہ رب العالمین الرحمٰن الرحیم مالک یوم الدین ایاک نعبد و ایاک نستعین۔

(فاتحہ / ۲ تا ۵)

"تمام تعریفیں اللہ سے مخصوص ہیں جو کہ عالمین کا پالنے والا ہے، مہربان و رحم کرنے والا ہے، قیامت کے دن کا مالک ہے ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔"

اس بنا پر ستائش و رازگوئی، دعا و حاجت اور عبادت اور نماز کی ادائگی سب خدا کے لئے ہے۔

اطاعت میں توحید

جب انسان کائنات کو خدا کی کرشمہ سازی اور اپنے کو نیز کائنات کے تمام موجودات کو خدا کا محتاج پائے گا اور صرف خدا ہی کو لائق عبادت وحمد اور دعا سمجھے گا تو اس کے حکم کی اطاعت کرے گا اور فقط اسی کو لائق اطاعت سمجھے گا۔

خدا کی اطاعت اس کے حکم کے سامنے بغیر کسی قید و شرط کے تسلیم ہوجانا اور ہر اس حکم کو ٹھکرا دینا جو خدا کی معصیت کے لئے ہو، اطاعت میں توحید اور عبادت میں توحید کا ثمرہ ہے۔

موحد صرف خدا کی اطاعت کرتا ہے، پیغمبر و امام کی اطاعت بھی خدا ہی کی اطاعت ہے[1] ماں باپ کی اطاعت بھی خدا ہی کے حکم سے ہے لیکن یہ اطاعت مطلق نہیں ہے یعنی اس میں یہ شرط ہے کہ اس اطاعت میں خدا کی نافرمانی نہ ہو۔[2]

ولایت و محبّت میں توحید

موحد کی بلند ترین دوستی اور شدید ترین محبت خدا سے مخصوص ہے وہ اسی کے عشق میں زندہ رہتا ہے، پیغمبر، ائمہ، والدین اور مومنین کی محبت میں بھی اسی کی محبت کے رشتہ ہیں، اس موحد کے دل میں آتش عشق اتنی بھڑک اٹھتی ہے کہ خدا کیلئے اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔

زندہ رہتے میں بھی اس کا مقصود خدا ہے اس کا انہماک و کوشش اور موت و حیات بھی اسی مقصد تک رسائی کے لئے ہے چنانچہ بے تابانہ اس تک پہنچ جانا چاہتا ہے۔

والذین آمنوا اشد حبا للہ (بقرہ/۱۶۵)

"جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کی شدید ترین محبت خدا سے مخصوص ہے۔"

---

[1] اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم یعنی خدا و رسول اور ان اماموں کے حکم کی اطاعت کرو جو خدا و رسولؐ کی طرف سے معین ہیں۔

[2] لقمان/۱۵

خلاصہ

(۱) قرآن، و اسلام میں توحید و یکتا پرستی بہترین و عالی پیرایہ میں بیان ہوئی ہے، قرآن پہلے کائنات کے خالق کی وحدانیت کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے۔ اس کے بعد نتیجہ نکالتا ہے کہ خدا کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔

(۲) جب یہ معلوم ہوگیا کہ کائنات کے تمام موجودات چاند، سورج ستارے، آگ پانی، بارش وغیرہ سب خدا کے محتاج و فرمانبردار ہیں تو پھر ان کی عبادت نہیں کی جاسکتی۔

(۳) جب انسان خدا کو کائنات کا سب کچھ پائے گا تو صرف اسی کو لائق پرستش سمجھے گا۔ اور اسی کی اطاعت و پیروی کرے گا ایسی اطاعت جس میں کوئی چون وچرا نہیں ہے۔

سوالات

(۱) امر و خلق میں توحید کی وضاحت کیجئے۔

(۲) عبادت میں توحید سے کیا مراد ہے؟

(۳) عبادت، دعا، حمد سب ہی کیوں خدا سے مخصوص ہیں؟

(۴) اطاعت میں توحید کی وضاحت بیان کیجئے۔

(۵) کیا پیغمبرؐ، ائمہؑ اور والدین کی اطاعت، اطاعت میں توحید کے منافی ہیں؟

شرک کے ریشے اور ڈورے

- شرک سے مستقل جنگ
- امر و خلق میں شرک
- عبادت میں شرک
- ریا، خفیہ شرک
- خلاصہ
- سوالات

شرک کے ریشے

توحید کی شاہ راہ کے برابر ہی شرک کا بے راہا بھی مختلف شکلوں میں موجود ہے۔ شرک کے بعض سلسلے بہت وسیع اور عمیق ہوتے ہیں، اسے "شرک جلی" کہا جاتا ہے۔ یہ شرک ممکن ہے انسان کے دل میں اس طرح ریشہ دوانی کرے کہ اسے یکتا پرستی کی راہ سے ہٹادے اور دائرۂ توحید سے نکال کر کفار و مشرکین کی صف میں بٹھادے۔ شرک کی دوسری قسم "شرک خفی" ہے۔ یہ انسان کو یکتا پرستی سے نہیں ہٹاتا ہے لیکن انسان کو توحید کے بلند ترین مفاہیم سے بھی آشنا نہیں ہونے دیتا ایسا شرک توحید کامل کے منافی ہے لیکن دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کا باعث نہیں ہے۔

شرک سے مستقل جنگ

خدا کے وجود کا اعتقاد ہمیشہ سے انسان کے ذہن میں موجود ہے گویا خداجوئی اس کی فطرت میں موجود ہے، بشر ہمیشہ سے خدا کے وجود کا معتقد رہا ہے۔ لیکن بعض انسانوں کا یہ عقیدہ گوناگوں قسم کے شرک سے آلودہ ہوگیا ہے۔

ولئن سالتھم من خلق السمٰوات والارض وسخر الشمس والقمر لیقولن اللّٰہ (عنکبوت/٦١)

اگر تم ان سے پوچھو! کہ زمین و آسمان کس نے خلق کیا ہے اور سورج

وچاند کو کس نے اپنے حکم کا تابع بنایا ہے تو کہیں گے، خدا نے۔"

بہت سے ادیان و مذاہب میں خدا کے وجود کا عقیدہ پایا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ یہ اعتقاد بھی موجود ہے کہ کوئی خدا کا ہمسر و نظیر نہیں ہے، وہ خداؤں کا خدا ہے، وہ اس منزل میں یکتا ہے لیکن کچھ دوسرے خدا بھی ہیں ان کی خدائی بھی اپنی جگہ مسلم ہے بس ان کا مقام بڑے خدا سے کم ہے۔

شرک سے جنگ کے لئے ہمیشہ پیغمبر مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ پیغمبروں نے انسانوں کو توحید و یکتا پرستی کی دعوت دی، شرک و خرافات پرستی سے روکا، ان کا پیغام تھا کہ ان موہوم و مصنوعی خداؤں کی پرستش و عبادت کے بجائے خدائے واحد کی عبادت کرو۔

امر و خلق میں شرک

بعض لوگ کائنات کی تخلیق اور اس کے نظم و ربط کے لحاظ سے دو چیزوں کے معتقد ہیں۔

خیر و نیکی کا نور سے پھوٹتا ہے اور شر و بدی ظلمت و تاریکی سے وجود میں آتی ہے اسلام کے نقطۂ نظر سے اس شرک کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے یہ امر و خلق کے مقابل میں ہے۔ مانویوں اور مزدکیوں کا یہی نظریہ ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو کائنات کی اصل ایک خدا کو جانتے ہیں، اس کی تخلیق کا مبدء بھی ایک ہی جانتے ہیں لیکن کائنات کے نظم و نسق میں دوسرے

خداؤوں کو بھی شریک سمجھتے ہیں یہ شرک کی واضح قسم ہے اور زرتشتیوں کا یہی عقیدہ ہے۔

عبادت میں شرک

بعض لوگ کائنات کی تخلیق اور اس کے انتظامی امور کو خدا سے مخصوص جانتے ہیں لیکن عبادت میں خدا کے ساتھ کچھ اور چیزوں، مثلاً پتھر، لکڑی، دھات، حیوانات، ستارے، اور سورج کو بھی پوجتے ہیں۔ ماضی میں تو اس شرک کی بہتات تھی اب بھی دنیا کے گوشہ و کنار میں پایا جاتا ہے۔ اس کو جلی شرک کہتے ہیں۔

چونکہ عبادت و پرستش اور حاجت طلبی و ستائش میں توحید کی زیادہ اہمیت سمجھی جاتی ہے لہذا اوستا کی، درج ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیں:

"اے اہورا مزدا، اردی بہشت کی مدد سے جو کہ پاک اور نیک لوگوں کو آرام دیتا ہے خاکی اور مبارک دنیا کی آبادی کو اور مجھ کو کہ میں تیری بارگاہ میں خلوص کے ساتھ دعاگو ہوں، عظمت دے۔"

"اے اردی بہشت، بہمن و مزدا اہورا اور سپندار مذرا کہ جو پاکیزہ اور دینداروں کے لئے جاویدانی اور مبارک ملک کو سنوارتے ہیں۔ ہم آئین کے لحاظ سے آپ پر درود بھیجتے ہیں آپ مدد کے وقت ہمارے مدد کریں۔"[1]

---

[1] اوستا ص ۳۲ بند ۲ و ۳

"اے اردی بہشت نیک منش لوگوں کے لئے جزا و سرخ روئی اور جنت کو آسان کر دے، اے سپندار مذ، ان کی حاجتوں کو پورا کر دے۔"

"اے مزدا، اے بادشاہ، اپنے پیغمبروں کو اس بات کی قدرت عطا کر کہ وہ تیری حمد کر سکیں[1]۔"

صحیح ہے کہ اوستا (اہورا مزدا) کو سب سے بڑا خدا جانتا ہے اور اہرمن اور فرشتوں کو اس کے برابر نہیں جانتا ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ کہ جب حمد و ستائش یا دعا کی نوبت آتی ہے تو "اہورامزدا" بہمن، اردی بہشت سپندار مذ وغیرہ کی بھی ستائش کی جاتی ہے اس سے بھی دعا مانگی جاتی ہے۔ جبکہ خالص توحید، جو کہ قرآن میں بیان ہوئی ہے، تمام عبادتوں اور دعاؤں کو خدا سے مخصوص قرار دیتی ہے اور غیر خدا سے اس کی نفی کرتی ہے۔

ریا، خفیہ شرک

عبادات میں ریا، ایک قسم کا خفیہ شرک ہے جو کہ خالص توحید کے منافی ہے۔ پیغمبرؐ کی ایک حدیث میں بیان ہوا ہے شرک لوگوں کے دل میں اس چیونٹی کے چال سے بھی زیادہ خفی چال میں چلتا ہے جو تاریک رات میں صاف پتھر پر چلتی ہے[2]

---

[1] اوستا ص ۳۳

[2] بحارالانوار ج ۷۲، ص ۹۳ طبع اسلامیہ تفسیر قمی ج ا ص ۲۱۳، انعام کی آیت ۱۰۸ کے ذیل میں۔

اس خفیہ شرک کا سرچشمہ خود ستائی ہے جس کو اسلامی تہذیب میں نفس امارہ کہا جاتا ہے۔ انسان کی اپنے منافع اور انانیت کا سوتا نفس امارہ سے پھوٹتا ہے اور روایت میں اسے عدو کہا گیا ہے۔[1] نفس امارہ آدمی کو خود خواہی اور خود پرستی کی زنجیروں میں جکڑ دیتا ہے، انسان کا خطرناک ترین دشمن وہ ہے جو اس کے خون کے ساتھ اسکی رگوں میں دوڑتا ہے اور اس کے دل میں بیٹھا ہوا ہے۔ یقیناً اس دشمن سے جنگ کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ ہمت درکار ہے۔ اسی لئے اس کو جہاد اکبر کہا جاتا ہے۔[2]

---

[1] اعدیٰ عدوك نفسك التی بین جنبیك (کنوز الحقائق ص ۱۴)

[2] امام جعفر صادق سے نقل ہوا ہے کہ پیغمبرؐ نے ایک گروہ کو جنگ پر بھیجا جب وہ واپس آیا تو آپؐ نے فرمایا: خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو جہاد اصغر سے واپس آئے ہیں اور ان کے سامنے جہاد اکبر ہے۔ کسی نے عرض کی یا رسول اللہ! جہاد اکبر کیا ہے؟ فرمایا: جہاد بالنفس۔ (وسائل ج ۶ ص ۱۲۴)

خلاصہ

۱. توحید کی شاہراہ کے برابر میں شرک کی بھی متعدد راہیں اور ریشے ہیں جیسے خلق و امر اور عبادت میں شرک ۔

۲. تمام آسمانی پیغمبروں کا پیغام، توحید و یکتا پرستی ہے اور وہ شرک و چند خداؤں کے عقیدہ سے جہاد کرتے رہے ۔

۳. تمام انانیتوں کا محور نفس امارہ اور خود پرستی ہے، روایات میں اسے خطرناک دشمن کہا گیا ہے کامل یکتا پرستی یہ ہے کہ موحد ہر قسم کے شرک و خود پرستی سے جنگ کرتا رہے ۔

سوالات

۱. واضح اور مخفی شرک کی وضاحت کیجئے ۔

۲. پیغمبروں نے لوگوں کو کس چیز کی طرف بلایا ؟

۳. امر و خلق میں شرک کی وضاحت کیجئے ۔

۴. عبادت میں شرک کی وضاحت کیجئے ۔

۵. ریا کیا ہے اور کامل توحید تک کیسے پہنچا جاسکتا ہے ؟

خدا کے اسماء وصفات کی معرفت

- اسم وصفت
- نسبی شناخت
- خلاصہ
- سوالات

خدا کے اسماء و صفات

ہمیں اس بات کا علم ہے کہ کائنات اور اس کے موجودات کے مجموعے کا پیدا کرنے والا ایک ہے۔ اب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس خالق کے صفات و خصوصیات کیا ہیں۔

اسم و صفت

جس کلمہ سے بھی کوئی ذات مراد لی جاتی ہے اسے اسم کہتے ہیں اور جو کلمہ کسی چیز کے وصف کو سمجھانے کے لئے استعمال ہوتا ہے اسے صفت کہتے ہیں مثلاً اس جملہ "احمد طاقتور ہے" میں احمد اسم ہے اور طاقتور صفت ہے[1]۔

خدا کے اسماء اور اس کے گوناگوں صفات انشاءاللہ ہم خداشناسی کی بحثوں میں بیان کریں گے۔ اسماء و صفات کی بحث سے قبل ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ کیا ہمیں خدا کی اتنی معرفت حاصل ہو چکی ہے کہ اس کے اسم و صفت سے بھی آگاہی حاصل کر سکیں یا اتنا ہی علم کافی ہے کہ وہ ہے اور بس؟

نہ تعطیل اور نہ تشبیہ

آپ کی دو اشخاص سے دوستی ہے اور ان دونوں کو اچھی طرح پہچانتے

---

[1] کبھی اسم و صفت ایک ہی معنی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

ہیں لیکن کیا ان کے روحی و جسمی خصوصیات سے بھی واقف ہیں ؟ نہیں، آپ کو انکی جو معرفت ہے وہ نسبی ہے خدا کے بارے میں بھی ہماری یہی کیفیت ہے۔

انسان کو ہستی کے مبدأ و منبع کی کامل معرفت حاصل نہیں ہو سکتی لیکن اس کی مخلوقات کے ذریعہ اس کی نسبی معرفت حاصل کر سکتا ہے ۔

اس بنا پر خدا کی معرفت کے سلسلہ میں یہ کہنا چاہئے کہ اگر خدا کی ذات کی کامل معرفت اور اس کی کنہہ کا پتہ لگانا مراد ہے تو اس کے لئے انسان کی عقل کافی نہیں ہے ۔

اگر چند جہتوں سے اس کی معرفت مراد ہے یعنی وہ معرفت جو اسے دیگر موجودات سے ممتاز کرتی ہے تو انسان کو ایسی معرفت حاصل کرنا چاہئے تاکہ اس کے وجود کا علم حاصل کر سکے ۔ ممکن ہے کسی چیز کی دسیوں علتیں اور نشانیاں ہوں کہ جو اسے دوسری چیزوں سے ممتاز کرتی ہیں اور ہم ان ہی خصوصیات کے ذریعہ اسے اچھی طرح پہچان سکتے ہیں ۔

اس بنا پر جب انسان خدا کے بارے میں غور و فکر کرتا ہے تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہے : میں نہیں جانتا کہ کیا ہے لیکن جو کچھ ہے تو ہی ہے ۔ لیکن جب موجودات و مخلوقات پر نظر ڈالتا ہوں تو خدا کے بعض خصوصیات سے آگاہی حاصل کرتا ہوں ۔ مختصر لفظوں میں یہ کہنا چاہئے کہ جو شخص بھی خدا کے وجود کو قبول کرتا ہے وہ اس کی صفت کے ذریعہ پہچانتا ہے ۔ جیسے اس کی صفت، مبداء، خالق، رب، عالم، قادر وغیرہ ...

خلاصہ

① خدا کی معرفت کے سلسلہ میں بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ اس کی معرفت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ انسان یہ جان لے کہ وہ ہے اور دوسرے جو الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں وہ خداشناسی کی راہ سے دور ہیں۔

② اس کے بالمقابل ایک گروہ خدا کی معرفت کے لئے اس کو موجودات جیسا سمجھتا ہے اور اس کے لئے شکل و شمائل جسمانی صفات تصور کرتا ہے۔

③ اگر خدا کی کامل معرفت مراد ہے تو ایسی معرفت انسان کے قبضہ کی بات نہیں ہے لیکن انسان مخلوقات کے ذریعہ خدا کی نسبی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔

سوالات

① خدا کے اسم وصفت کی تعریف بیان کیجئے۔
② تعطیل کی تعریف بیان کیجئے اور اس کے اشکالات لکھئے۔
③ تشبیہ کی تعریف بیان کیجئے اور اس کے اشکالات قلم بند کیجئے؟
④ کیا انسان مبداء ہستی کی نسبی معرفت حاصل کرسکتا ہے؟
⑤ کیا انسان خدا کی کامل معرفت حاصل کر سکتا ہے؟

خدا کے اسماء و صفات

- قرآن میں خدا کے اسماء و صفات
- منفی پہلوؤں کو ہم کیسے سلب کر سکتے ہیں.
- خدا کی پاکیزگی
- خلاصہ
- سوالات

قرآن میں خدا کے اسماء و صفات

ہم کہہ چکے ہیں کہ انسان کو مبداء ہستی کی کامل معرفت نہیں حاصل ہو سکتی۔ لیکن اس کی مخلوقات کو دیکھ کر اس کی نسبی معرفت حاصل کر سکتا ہے البتہ ان معرفتوں میں سے ایک بھی اس کی کامل معرفت نہیں ہے۔ ایسی معرفت کے ذریعہ جتنے بھی مثبت پہلو حاصل ہوتے ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں لیکن جتنے بھی منفی اور محدود پہلو ہیں جو کہ نسبی معرفت میں اور مثبت پہلو کے ساتھ ساتھ ہیں وہ ان سے منزہ ہے۔

اس طرح بہترین نام اور صفات بھی اس کی لامتناہی ذات کے مفہوم کو واضح نہیں کر سکتے ان کو ایک شرط کے ساتھ خدا کے لئے استعمال کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہ ان سے منفی اور محدود کرنے والے پہلو سلب کریں ورنہ وہ خدا کو ہمارے سامنے غیر حقیقی اور محدود صورت میں پیش کریں گے جس کا اس کی حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ خدا ہر اسم وصفت سے برتر ہے وہ اوصاف کے بیان نہیں آسکتا، اس کی معرفت کا بلند ترین درجہ یہ ہے کہ اس کو ہم معرفت سے برتر جانیں۔

وکمال توحیدہ الاخلاص لہ وکمال الاخلاص لہ نفی

نفی الصفات عنه ....

اس کی توحید کا کمال یہ ہے کہ ہم اسے خالص و مطلق جانیں اور اسے خالص جاننے کا کمال یہ ہے کہ اس سے صفتوں کی نفی کریں۔[1]

بنابرایں اہم بات یہ ہے کہ جو اسم وصفت بھی ہم خدا کے لئے استعمال کریں اس میں منفی پہلو نہ ہو اور اس کے کمال مطلق ہونے سے سازگار ہو۔

و للہ الاسماء الحسنیٰ فادعوہ بہا وذر والذین یلحدون فی اسمائہ سیجزون ما کانوا یعملون۔

(اعراف/۱۸۰)

"خدا کے لئے اسمائے حسنیٰ ہیں پس ان ہی کے ذریعہ اسے پکارو! اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے اسما میں الحاد کرتے ہیں وہ اپنے کئے کے بہت جلد پھل پائیں گے۔"

پس ان بہترین اسمائے حسنیٰ میں سے جن کے ذریعہ چاہو خدا کو پکارو! خواہ اس کے ذریعہ یا اس کے ذریعہ،

قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمٰن ایاً ما تدعوا فلہ الاسماء الحسنیٰ ...

(بنی اسرائیل/۱۱۰)

"(اے رسول) کہدیجئے کہ تم اسے اللہ کے نام سے یاد کرو یا رحمان کے نام سے پکارو جس نام سے چاہو پکارو کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس کے لئے اسما حسنیٰ ہیں۔"

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ اول

منفی پہلوؤں کو ہم کیسے سلب کریں

گزشتہ بیان سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ لطیف ترین اور بنیادی نکتہ خدا کو اسماء یا صفت کے نام سے یاد کرنے میں یہ ہے کہ اس میں منفی اور محدود کرنے والا پہلو نہ ہو، اگر ہم یہ کہیں کہ خدا دیکھتا ہے تو دیکھنے کے اوپر جو لفظ دلالت کرتا ہے اسے اسی کے معنی میں استعمال کریں، یعنی جو آنکھوں سے دیکھنے کے معنی سے کہیں زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔

جس وقت یہ کہا جاتا ہے: احمد نے تمہارا کام دیکھا ہے، تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ: اس کی آنکھوں میں تمہارے کام کی تصویر چھپ گئی ہے اور آنکھوں کی راہ سے بینائی کے مرکز "مغز" میں منتقل ہو گئی ہے اس طرح وہ تمہارے کام سے آگاہ ہوا ہے۔

اب یہ فرض کیجئے کہ احمد اندھا ہے، وہ نہیں دیکھ سکتا لیکن اگر علمی جدوجہد اور ڈاکٹری سے اندھوں کے لئے الیکٹرونک کی آنکھیں بنا لی جائیں جو کہ تصویروں کی لہروں کو لے کر بغیر آنکھوں کے سیدھے بینائی کے مرکز مغز میں منتقل کر دیں تو یہاں دیکھنے والے لفظ سے ایک محدودیت ختم ہو جائے گی اور وہ یہ کہ دیکھنا صرف طبعی آنکھوں ہی میں محدود نہیں ہے۔

بہت زیادہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ دیکھنا سے بہت سی بندشیں ہمارے ذہن میں آتی ہیں یا تو لفظ دیکھنا سے انکا کوئی ربط نہیں

ہے یا ان کی دخالت اس اساسی نکتہ میں نہیں ہے جسے "دیکھنا" کہتے ہیں، "دیکھنے" کے مورد میں اساسی نکتہ یہ ہے کہ وہ چیزوں کو ہمارے سامنے رکھ سکتا ہے۔ اسی لئے لفظ "دیکھنا" اور اس کے مشتقات اس روشن آگہی کی طرف اشارہ ہیں۔

ایک شخص آنکھ سے دیکھتا ہے اور دوسرا عمیق فکر اور تجربہ سے دیکھتا ہے۔ ایک آنکھ (بصر) سے دیکھتا ہے، دوسرا بصیرت اور دل کی آنکھوں سے دیکھتا ہے، ان معنوں میں ہم خدا کو بصیر کہتے ہیں، خدا بصیر ہے یعنی جو کچھ آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے خدا اس سے باخبر ہے۔

قرآن میں ارشاد ہے: "للہ الاسماء الحسنیٰ" خدا کے لئے اسمائے حسنیٰ ہیں یعنی جس نیکی اور جلوۂ کمال کے بارے میں تم سوچ سکتے ہو، اس سے بلند ترین مرتبہ خدا کا ہے، مثلاً طاقت ایک کمال ہے اور خدا سب سے بڑا طاقت والا اور قادر مطلق ہے، "ان اللہ علی کل شیٔ قدیر" بے شک خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

علم بھی ایک کمال ہے اور خدا سب سے بڑا عالم ہے وہ ہر آشکار اور مخفی چیز سے باخبر ہے۔ "انّ اللہ بکلّ شیٔ علیم"[1] بے شک خدا تمام چیزوں کا جاننے والا ہے۔

مہربانی اور محبت اختیار کرنا بھی کمال ہے اور خدا "رحمٰن و رحیم" ہے اور وہ سب سے بڑا شفیق ہے وہ ارحم الراحمین ہے۔

---

[1] توبہ / ۱۱۵

خدا کی پاکیزگی

خداوند عالم کے پاس ہر کمال کا بلند ترین مرتبہ ہے، وہ ہر نقص وعیب سے پاک ہے، ہر نیاز واحتیاج سے منزہ ہے، وہ مطلق طور پر بے نیاز ہے، بیٹے سے بے نیاز ہے، زمان ومکان سے مستغنی ہے، ہماری اطاعت اور عبادتوں اور تمام چیزوں سے مستغنی ہے.

"یاایّھا النّاس انتم الفقراء الی اللہ واللہ ھو الغنی الحمید"

(فاطر/۱۵)

"اے لوگو! تم خدا کے محتاج ہو لیکن خدا غنی وحمید ہے۔"

کیتھولک کلیسائی مذہب خدا کی ولادت اور اس کے بیٹے سے متعلق کہتا ہے:

"..... ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا ایک ہے وہی باپ ہے، قادر مطلق ہے، تمام دیکھی جانے والی اور نہ دیکھی جانے والی چیزوں کا وہی خالق ہے اور اسی اکیلے خدا کے عیسیٰ بیٹے ہیں، باپ سے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد ہیں..... وہ ہم لوگوں اور ہماری نجات کی خاطر زمین پر اترے اور مجسم ہوئے، انسان بن گئے، تکلیفیں اٹھائیں اور تیسرے روز آسمان کی طرف پرواز کر گئے..."[1]

---

[1] مسیحیت کا سرکاری اعتقاد نامہ ۳۲۵ء منقول از تاریخ کلیسائے قدیم در شہنشاہیت روم و ایران ص ۲۳۵ ایڈیشن ص ۲۹۲

پوری انجیل میں خداوند عالم کے لئے ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں کہ جن کی کسی طرح بھی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ ہندوستان کے برہمنوں کے مذہب میں بھی کائنات کی تخلیق کو خالق کے پیکر سے متولد قرار دیا گیا ہے چنانچہ تارتن اپنے تار کو لمبا کرتا ہے یا نیچے لٹکا دیتا ہے اور زمین پر گھاس پھوس اگنے لگتی ہے اسی طرح سروتن کے جسم کے بالوں سے جاندار پیدا ہوئے ہیں اور ذات لایزال سے تمام موجودات جنم لیئے ہیں[1]

دوسری جگہ بھی خدا کی ولادت سے متعلق بحث موجود ہے:

"خدا تمام آسمانوں کے سامنے ہے وہ ازل سے جنم لیئے ہوئے ہے، وہ رحم کے اندر ہے وہ پیدا ہو چکا ہے اور پیدا ہوگا[2]"

اب قرآن کے قول کو ملاحظہ فرمائیے۔ تاکہ خالص خداشناسی اور اسلام کی بلند ترین یکتا پرستی کا اندازہ لگا سکیں

قل هو الله احد الله الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن له کفواً احد۔[3]

"کہدیجئے خدا ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے۔ اس سے کوئی پیدا نہیں ہوتا ہے اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔"

---

[1] منتخبہ اوپانیشادھا ص ۳۹۲ [2] منتخبہ ایدیشن ص۲۴۳

[3] سورہ اخلاص

خلاصہ

۱) خدا کے لئے جو بھی اسم و صفت استعمال ہوتی ہے اسے منفی اور محدود پہلو سے خالی و عاری ہونا چاہئے تاکہ اس کے کمال مطلق ہونے کے منافی قرار نہ پائے۔

۲) منفی پہلوؤں کو اس سے اس طرح جدا کریں کہ ان معلومات کے اساسی نکتہ کو محدودیتوں اور بندشوں سے خالی کریں۔

۳) قرآن کے لحاظ سے خدا کے لئے بہترین اسما ہیں اور ہر کمال کا بلندترین مرتبہ اسی سے مخصوص ہے اس بنا پر وہ ہر قسم کے نقص و عیب سے پاک ہے۔

سوالات

۱) انسان خالق کی نسبی معرفت کو کس طرح حاصل کر سکتا ہے؟

۲) خدا کے لئے ہم جو اسم یا صفت استعمال کرتے ہیں اسے کن خصوصیات کا حامل ہونا چاہیئے؟

۳) ہم اپنی معلومات و معرفتوں کو، منفی اور محدود کرنے والے پہلوؤں سے کیسے پاک کر سکتے ہیں؟

۴) قرآن مجید میں خدا کے اسما و صفات کس طرح بیان ہوتے ہیں؟

ایمان، مسئولیت ساز و امید آفرین

- سکون کی تلاش
- مصیبتوں کے ڈھانے پر
- موجوں کی زد پر
- اجتماعی میدان میں
- خلاصہ
- سوالات

ایمان، مسئولیت ساز و امید آفرین

مثالی تصور کائنات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو امیدوار بناتا ہے، اور اس کی زندگی کو درخشاں اور پر مسرت بناتا ہے۔ اس سبق میں ہم اس بات کی وضاحت کریں گے کہ صرف الٰہی تصور کائنات کے پرتو میں اور فقط خدا پر ایمان کے سایہ میں انسان اپنی زندگی کو جدوجہد اور نشاط و توقع کے ساتھ گزار سکتا ہے۔

سکون کی تلاش

انسان کی خواہشوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ محدودیت قبول نہیں کرتی ہیں۔ انسان کے میلانات کسی منزل پر بھی ختم ہوتے وہ طاقت و شہرت کے کسی مرتبہ پر بھی قناعت نہیں کرتا ہے وہ ثروت و شہوت کے سلسلہ میں کسی ایک جگہ نہیں ٹھہرتا ہے اس کی ہوس کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔

دوسری طرف دنیا اور اس کی مادی چیزیں ہر طرح محدود و مختصر ہیں اور ان ہی محدود چیزوں میں سارے انسان حصہ دار ہیں۔ انسان (کا دل) احتیاجات سے لبریز اور نامحدود میلانات سے سرشار ہے وہ اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ اور رات دن کار و کوشش میں مشغول رہتا ہے لیکن اسے جو کچھ ملتا ہے وہ اسے قانع نہیں کرتا ہے۔ اگر اسے فرعون کی سلطنت اور قارون کا خزانہ دیدیا جائے تو بھی اس کی خواہشوں کے شعلے خاموش نہیں ہونگے۔

لہذا مضطرب و پریشان اپنی محدود و فنا پذیر کمائی کو دیکھتا ہے تو اس کی پریشانی اس کی روح کو مزید بے تاب کر دیتی ہے اور اس کی تمام تگ و دو اور زندگی کا اضطراب بڑھتا چلا جاتا ہے۔

مادی اور خاکی جہاں اپنی تمام رعنائیوں کے باوجود، جو کہ متلاطم دریا اور ہلاکت خیز بھنور ہے انسان کو چاہئیے کہ وہ اس کی موجوں سے نکل کر با آرام ساحل کی طرف بڑھنے کی کوشش کرے اور اپنے وجود کو ہستی مطلق سے ملائے۔ کمال مطلق سے ملحق ہونے سے ہی انسان کو حقیقی آرام اور پریشانیوں سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔

مصیبتوں کے دھانے پر

جس شخص کا دل نور ایمان سے منور ہے و رنج و الم کے وقت خدا کی طرف لو لگاتا ہے اور اسی سے امید وابستہ رکھتا ہے۔ وہ دنیا کو امتحان گاہ تصور کرتا ہے اور خود کو معرض امتحان و ابتلا میں سمجھتا ہے وہ دنیا کو چرا گاہ اور خواب گاہ خیال نہیں کرتا ہے جو کہ دنیوی آرام اور چین کے اسباب ختم ہو جانے پر خراب ہو جاتی ہے اور زندگی تاریک ہو جاتی ہے۔ اگر انسان کو بلند ترین مقام مل جاتا ہے تو وہ اسے ایک تکلیف سمجھتا ہے اور اس پر مغرور نہیں ہوتا ہے اور اگر اس پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹنے لگیں تو صابر و بردبار اور ... لیکن مادی انسان کا مقصد یہی خاکی دنیا ہے وہ کسی مقام تک پہنچنے کے لئے بال و پر مارتا ہے اور جیسے ہی اس کا مقام چھن جاتا ہے تو دنیا اس کی نظروں میں تیرہ و تار ہو جاتی

ہے اور زندگی تلخیوں سے بھر جاتی ہے۔

مرد خدا موت کو فنا تصور نہیں کرتا ہے بلکہ موت کو بہترین وابدی زندگی گزرنے کے لئے نیا جنم سمجھتا ہے۔ لیکن مادی انسان موت کو اپنی عمر کا اختتام تصور کرتا ہے۔ لہٰذا موت اور بڑھاپے کی فکر اس کے مستقبل تاریک بناتی ہے اور عمر کے آخری مراحل میں متحرک مردہ کی طرح ہوجاتا ہے۔ اس کا دل سیاہ ہوجاتا ہے اس کے وجود پر غم واندوہ سایہ فگن ہوجاتے ہیں۔

موجوں کی زد پر

مومن کے لحاظ سے فتح وشکست میں فقط ظاہری پہلو ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ اسے اس ذمہ داری کے لحاظ سے دیکھتا ہے جو اس کے دوش پر ہوتی ہے، اس نقطۂ نظر سے شکست نام ہے فریضہ کی انجام دہی میں کوتاہی کا جبکہ فریضہ کی انجام دہی کی توفیق کو کامیابی کہا جاتا ہے۔

مومن زندگی کے جھمیلوں اور اجتماعی دشواریوں میں خدا کی رضا کا طلبگار ہوتا ہے وہ دنیا کو بھی اچھی نگاہوں سے دیکھتا ہے کیونکہ اسے خدا کے ارادہ کا جلوہ سمجھتا ہے، اپنی زندگی سے بھی خوش رہتا ہے اور چونکہ حوادث ومشکلات کو مقدر تصور کرتا ہے اور خود کو امتحان گاہ میں محسوس کرتا ہے اس لئے اس کے دل میں یاس و اضطراب پیدا نہیں ہوتا ہے۔

یہ چیز تسلیم ورضا، جدوجہد اور خدا پر توکل کے ساتھ، انسان کی زندگی کو خاص شیرینی عطا کرتی ہے اور اسے مشکلات ناسازگار حالات سے ٹکرانے

کی قوت دیتی ہے۔

اجتماعی میدان میں

صحیح اجتماعی زندگی وہ ہے کہ جس میں لوگ ایک دوسرے کے حقوق کو محترم سمجھتے ہوں، عدالت کو ایک مقدس امر تصور کرتے ہوں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں اور یہ چیزیں فقط ایمان کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔

مومن خود کو ہمیشہ خدا کی نظروں کے سامنے سمجھتا ہے اور یہ تصور کرتا ہے کہ خدا میری دلی کیفیتوں سے آگاہ ہے اور معاشرہ کے لوگوں کے لئے جان و مال قربان کرنے کے لئے تیار رہتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں خدا سے منافع والی تجارت کر رہا ہوں۔[1]

لیکن انسان اپنے منافع حاصل کرنے کے لئے کوئی بھی کام کر بیٹھتا ہے یہاں تک گھروں کو اور شہروں کو ویران کر دیتا ہے۔ اور ہزاروں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ اس وقت قانون کا لحاظ کرتا ہے جب اس کے منافع کو خطرہ لاحق نہیں ہوتا ہے یا پولیس کو اپنے کاموں کا نگہبان سمجھتا ہے۔

---

[1] یا ایھا الذین آمنوا ھل ادلکم علیٰ تجارۃ تنجیکم من عذاب الیم ۔ تؤمنون باللہ و رسولہ و تجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم و انفسکم ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون ۔ "اے ایمان لانے والو! کیا میں اس تجارت کی طرف تمہاری راہنمائی کروں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلائے؟ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اپنے جان و مال سے راہ خدا میں جہاد کرو اسی میں تمہاری بھلائی ہے اگر تم عقلمند ہو۔"

الصف / ۱۰ و ۱۱

خلاصہ

(۱) انسان کی خواہش بے پناہ ہیں۔ اگر انھیں پورا کرنے کے لئے خاکی جہان کی طرف متوجہ ہوگا تو اس کی کوششوں کا نتیجہ حیرانی و پریشانی ہوگی، اسے سکون حاصل کرنے کے لئے خدا سے لو لگانا چاہئے کیونکہ اسی کے ذکر سے دلوں کو آرام ملتا ہے۔

(۲) مومن زندگی کو معرض امتحان اور خود کو خدا کے سامنے سمجھتا ہے۔ وہ خدا کی رضا کا طلبگار رہے۔ اور اس پر توکل کی وجہ سے مایوس و ناامید نہیں ہوتا ہے۔

(۳) صحیح اجتماعی زندگی اس معاشرہ میں حاصل ہوتی ہے کہ جس کے افراد ایک دوسرے کے حقوق کا احترام کرتے ہیں اور یہ کام صرف ایمان کے پرتو میں ممکن ہے۔

سوالات

(۱) مادی انسان کو کیوں اطمینان نہیں حاصل ہوتا؟

(۲) سکون و اطمینان کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟

(۳) ایمان کے بغیر زندگی کیوں تلخیوں سے بھر جاتی ہے؟

(۴) ایمان مشکلوں اور مصیبتوں کو کیسے شیرینی میں بدل دیتا ہے۔

(۵) اجتماعی فلاح کو کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟

عدلِ الٰہی

- عدل کا تعلق اصول دین سے کیوں ہے
- عدل کی قسمیں
- خلاصہ
- سوالات

عدلِ الٰہی

کائنات کے پالنے والے کی ایک صفت عدل ہے۔ انسان پاک سرشت اور اپنے صاف ذہن سے نیکی و بدی کا ادراک کرتا ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ جھوٹ، ظلم و ستم، خیانت اور عہد شکنی بری چیز ہے اس کے برخلاف سچ بولنا، انصاف کرنا وعدہ وفا کرنا اچھی چیز ہے۔ یہاں تک کہ جھوٹ بولنے والے کو بھی یہ اعتراف ہے کہ جھوٹ بری چیز ہے اور خیانت کار کو بھی یہ تسلیم ہے کہ خیانت غلط کام ہے۔ ہر انسان خداداد پاک و پاکیزہ فطرت کے ذریعہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ فلاں کام غلط ہے اور فلاں صحیح ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ظلم و ستم بری چیز ہے اور عدل و انصاف اچھی صفتیں ہیں، اور چونکہ ظلم و ستم بری چیز ہے لہٰذا خدا اس سے پاک ہے۔ جو چیزیں ظلم و ستم کے ارتکاب کا باعث بنتی ہیں وہ یہ ہیں:

الف۔ اس بات سے ناواقفیت کہ ظلم بری چیز ہے، یعنی چونکہ وہ نہیں جانتا کہ ظلم برائی ہے اس لئے انجام دیتا ہے یا وہ نہیں جانتا کہ یہ ظلم ہے جیسے وہ ناپسند کام جو نادانی کی وجہ سے بچے کر ڈالتے ہیں۔

ب۔ انسان جانتا ہے کہ ظلم بری چیز ہے لیکن اسے چھوڑنے پر قادر نہیں ہے۔ بلکہ انجام دینے پر مجبور ہے یا اس کو انجام دینے کی ضرورت ہے، جیسے منشیات کا ضعیف الارادہ عادی کہ اپنی عادت چھوڑنے پر قادر نہیں ہے یا کمزور ایمان والا انسان کہ ضرورت کے تحت چوری کر لیتا ہے اور دوسروں کے حقوق

پامال کر دیتا ہے۔

بہر حال ظلم کے جس سبب کو بھی آپ دیکھیں گے اس کا سرچشمہ، نقص، عیب یا عجز کو پائیں گے اور خدا ان باتوں سے پاک ہے، خدا کا علم و قدرت کا لامحدود ہے۔ وہ ہر طرح بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ عدل ایک صفتِ کمال ہے اور ظلم ایک نقص ہے، خدا تمام کمالات اور نیکیوں کا سرچشمہ ہے اور ہر عیب سے منزہ ہے۔

عدل کا تعلق اصولِ دین سے کیوں ہے؟

ہم جانتے ہیں کہ عدل خدا کی صفات میں سے ایک صفت ہے، جس طرح خدا عالم، قادر، سمیع اور بصیر ہے اسی طرح عادل بھی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی تمام صفات میں سے عدل کو اصولِ دین میں کیوں قرار دیا گیا ہے اگر یہی طے ہے کہ صفات خدا کو اصولِ دین میں قرار دیا جائے تو ضروری ہے کہ علم، قدرت اور ارادہ وغیرہ کو بھی اصولِ دین ہی میں شمار کریں۔

شیعہ اور اہل سنت کا ایک گروہ، معتزلہ، خدا کے عادل ہونے کا معتقد ہے۔ چنانچہ انھیں عدلیہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اہل سنت کا ایک گروہ، جسے اشاعرہ کہا جاتا ہے خدا کو (اس معنی میں) عادل نہیں مانتا جس میں عدلیہ مانتے ہیں۔[1]

---

[1] اصول دین کے سلسلہ میں اہل سنت دو گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں ایک معتزلہ دوسرے اشاعرہ اس اختلاف کے متعلق آئندہ بحثوں میں کچھ مطالب بیان کئے جائیں گے۔

گزشتہ زمانہ میں عدل کا قائل اشعری نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ عدل وامامت کے قائل کو شیعہ سمجھا جاتا تھا۔ اشاعرہ کہتے ہیں کہ اصول دین تین ہیں اور شیعہ کہتے ہیں کہ اصول دین پانچ ہیں یعنی ان تین چیزوں کے علاوہ عدل وامامت کے قائل ہیں۔

عدل کی قسمیں

۱۔ **تخلیق میں عدل** : اسلام کے نقطہ نظر سے کائنات اور خلقت کے نظام کی بنیاد عدل پر استوار ہے۔ تلمرو تکوین اور کائنات کی تخلیق میں عدل کے معنی ہیں کہ پوری کائنات میں توازن و تعادل موجود ہے اور ہر چیز نظم کے تابع ہے۔

اس نظم سے لے کر، جو کہ ایک زندہ خلیہ میں چھپا ہوا ہے اور جو تب و تاب ایک ایٹم میں مخفی ہے، ایک زندہ موجود کے جسم میں لطیف نظم و ارتباط کارفرما ہے۔ اسی طرح نظام شمسی اور ستاروں اور کہکشاؤں کے نظام تک کہ جس کے قوانین و نظام اور انکشاف تک پہنچنے کی انسان کوشش کر رہا ہے۔

۲۔ **قانون سازی میں عدل** : خدا کے فرمان پیغمبروں کے ذریعہ بندوں تک پہنچائے گئے ہیں وہ سب عدل و حکمت اور مصلحت پر مبنی ہیں خدا نے ان میں انسان کی طاقت و قوت کو مدنظر رکھا ہے اور جو چیز جسمانی و روحانی رشد اور اجتماعی و فردی زندگی کے لئے لازم و ضروری ہے وہ بھی

بھیجی ہے۔

۳۔ **پاداش وجزا میں عدل :** قیامت کے روز خدا عدل کے مطابق فیصلہ کرے گا۔ اور جزا و سزا میں کسی پر ظلم نہیں کرے گا ہر شخص کے اعمال عدل کے ترازو میں تولے جائیں گے اور اسی کے مطابق جزا و سزا معین کی جائے گی۔

"ولا نکلف نفساً الا وسعھا ولدینا کتاب ینطق بالحق وھم لا یظلمون۔"

(مومنون / ۴-۶)

"ہم کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے اور ہمارے پاس کتاب ہے جو حق بیان کرتی ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

خلاصہ

۱۔ خدا کی ایک صفت عدل ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ عدل اچھا اور ظلم و ستم برا ہے۔ خدا ظلم سے پاک ہے کیونکہ تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ ظلم کا سرچشمہ نقص و عیب اور عجز ہے جبکہ خدا ہر نیکی اور کمالات کا سرچشمہ ہے اور ہر عیب و نقص سے پاک ہے۔

۲۔ صدر اسلام میں اسلامی علوم کے ماہرین کے درمیان عدل الٰہی کے مسئلہ میں اختلاف رونما ہوا چنانچہ شیعہ اور معتزلہ عدل کو اصول دین شمار کرتے تھے۔

۳۔ نظام تخلیق و تکوین میں عدل الٰہی کے جلوے آخرت میں قانون گزاری اور جزا و سزا کو مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

سوالات

۱۔ عدل الٰہی کے اثبات کے لئے آپ کے پاس کیا دلیل ہے؟

۲۔ ظلم کے ریشتے بیان کیجئے۔

۳۔ عدل کو اصول دین میں کیوں شمار کیا گیا ہے؟

۴۔ قلمرو تکوین میں عدل کی وضاحت کیجئے۔

۵۔ عدل تشریعی اور جزا و سزا کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

جبر و اختیار

- اشاعرہ کا نظریہ
- میدان سیاست میں جبری رجحان کا نتیجہ
- معتزلہ کا نظریہ
- خلاصہ
- سوالات

جبر و اختیار

انسان کے اختیار و آزادی سے متعلق عرصہ دراز قبل ذہن انسانی میں بحث نے جنم لیا اور دانشوروں نے اس سلسلہ میں کافی جانفشانی کی ہے۔ دنیا پر حاکم نظام جبری عوامل کے نتائج اور اختیار و انتخاب کے آثار فلسفہ و کلام کے اہم ترین مسائل میں سے ہیں۔ اس کی وسیع بحثوں میں فکری اور نظریاتی اختلاف سے لے کر تلواروں کی جھنکاروں تک نوبت پہنچی ہے۔ ایک جماعت انسان کو ایسا بے ارادہ موجود تصور کرتی ہے جیسا ہوا میں پھینکا ہوا پتھر اور دوسری جماعت اسے کامل طور پر مختار سمجھتی ہے۔

جب یہ بحث ان تمام ہنگاموں کے باوجود مسلمانوں کے درمیان ابھری تو بعض مسلمانوں نے اس بات کا سراغ لگانا چاہا کہ اسلامی افکار و عقائد میں اس موضوع کو کتنی اہمیت حاصل ہے اور ان کے اصول و عقیدہ سے اس کا کیا ربط ہو سکتا ہے؟

اشاعرہ کا نظریہ

مسلمانوں کا ایک گروہ چونکہ عزت و ذلت اور ہدایت و ضلالت کو خدا سے مربوط سمجھتا ہے لہٰذا انسان کو مجبور سمجھتا ہے۔ اس بات کو وہ اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ خدا کی توحید اور اس کی حاکمیت مطلقہ کا تقاضا یہ ہے کہ

کائنات کے تمام موجودات، یہاں تک کہ انسانوں کے اعمال، خدا کے ارادہ واختیار میں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر انسان کی آزادی واختیار کے قائل ہو جائیں تو گویا اس بات کا اعتراف ہوگا کہ خدا کے ارادہ کے ساتھ ساتھ ایک قدرت وطاقت اور موجود ہے۔ بنا بریں وہ خدا کی حاکمیت وارادہ کو مطلق نامحدود سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں، انسان مجبور ہے اس کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

یعنی جس طرح زرتشتی خیر وشر کے دو سرچشمے مانتے ہیں اور یزدان و اہرمن کو خیر وشر کا منبع تسلیم کرتے ہیں بالکل ایسے ہی وہ شخص ہے جو خدا کے ارادہ کے مقابل کسی دوسرے ارادہ کو قبول کرتا ہے اور جبر کا قائل نہیں ہے۔

میدانِ سیاست میں جبری رجحان کا نتیجہ

ایک طرف تو یہ نظریہ ظالم وستمگر حکومت کے عین مطابق تھا اور اسی لئے حکام نے اپنی ساری طاقت اس عقیدہ کی ترویج پر صرف کر دی تھی اور اسے منوانے پر بہت زور دیا تھا۔ چنانچہ اسی عقیدہ سے انہوں نے لوگوں کی زبانِ اعتراض بند کر دی اور حکومت کے تمام ظلم وستم اور خونریزی کی آسانی سے توجیہ ہونے لگی۔ دوسری طرف لوگوں نے حکومت کی مشنری کی اس شان و شوکت اور عیش ونشاط کو دیکھا اور خود کو فقر وناداری اور ذلت وبے چارگی میں محسوس کیا لیکن اسی عقیدہ کے حامل ہونے کی وجہ سے چون وچرا نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ خود کہتے تھے کہ تمام چیزیں خدا کے ہاتھ میں ہیں۔

وہ (حاکم) اس طرح نہ صرف اپنی عیش کوشیوں اور نشاط پروری میں لوگوں کے اعتراض سے بچ گئے تھے بلکہ ظالم اور خودسر بادشاہوں کی تمام خونریزیوں اور وحشیانہ ظلم وستم کو بھی خدا کا فعل قرار دیا جاتا تھا۔ کیونکہ اس عقیدہ کی رو سے وہ ان مظالم کے انجام دینے پر مجبور تھے اور اسی بنا پر اشاعرہ کا رجحان حکومتی مذہب بن گیا:

معتزلہ کا نظریہ

مسلمانوں کا دوسرا گروہ ان آیات کے پیش نظر جو اختیار کے عقیدہ کی تائید کرتی ہیں اس بات کا معتقد ہوگیا کہ انسان کو مطلق طور پر مختار بنایا گیا ہے چنانچہ اس عقیدہ کو "تفویض" کا نام دیا گیا۔

"تفویض" کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے کائنات اور انسانوں کو پیدا کر کے انکے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ انسانوں کے امور میں اسے کوئی دخل نہیں ہے، انسان مطلق طور پر آزاد ہے، جو چاہے کرے اسے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔

اس بنا پر خدا کے ارادہ کو صرف کائنات اور انسان کی تخلیق میں دخل ہے اور تخلیق کے بعد دنیا کے کاموں میں اسے کوئی دخل نہیں ہے، بالکل ایسے ہی جیسے ایک انجینئر نے ایک مشین بنا دی اور اسے چلا دیا اس کے بعد مشین کے امور میں اس کا دخل نہیں ہے۔

یہ لوگ اپنی بات پر پیغمبروں کی بعثت، بشارت اور ڈرانے، تکلیف، قیامت اور جنت وجہنم سے استدلال کرتے ہیں۔ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے

کہ لوگوں کے تمام کام درحقیقت خدا کے کام ہیں تو مظالم، گناہ اور فساد بھی خدا کے فعل وعمل قرار پائیں گے، جبکہ پروردگار ظلم وناروا افعال سے پاک وپاکیزہ ہے۔

یہیں سے اہل سنت کا یہ گروہ اور شیعہ، اشاعرہ کے مقابلہ میں آئے اور یہ اعلان کیا کہ خدا عادل ہے اور جبر کا عقیدہ خدا کے عدل کے منافی ہے پھر جبر کے رجحان کا لازمہ خدا کو ظالم جاننا ہے اور خدا ظلم سے پاک ہے اس طرح اشاعرہ کے سامنے جو کہ خدا کی حاکمیت مطلقہ اور توحید پر استناد کرتے تھے، خدا کی "تنزیہ" کا مسئلہ آگیا۔

خلاصہ

① اشاعرہ ان آیات کے پیش نظر جن کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ ہدایت و گمراہی اور عزت و ذلت خدا کے ہاتھ میں ہے، خدا کی حاکمیت مطلقہ اور توحید کے قائل ہوگئے اور انسان کو اپنے کام میں مجبور قرار دیدیا۔

② اشاعرہ کے عقیدہ نے ظالم حکومتوں کی حکمرانی کے لئے جواز کا پہلو پیدا کر دیا لہٰذا انہوں نے مذہب اشاعرہ کو خوب رواج دیا چنانچہ اس عقیدہ نے حکومتوں پر اعتراض کرنے والوں کی زبان کو بند کر دیا۔

③ معتزلہ ان آیات کے پیش نظر جو اختیار کے نظریہ کی تائید کرتی ہیں۔ تفویض کے قائل ہوگئے اور اشاعرہ کے سامنے میں خدا کی تنزیہ کا مسئلہ آگیا۔

سوالات

① جبر و اختیار کے متعلق کتنے نظریئے ہیں؟

② اشاعرہ نے اپنے نظریہ پر کیا دلیل پیش کی ہے؟

③ معتزلہ نے اپنے نظریہ پر کیا دلیل پیش کی ہے؟

④ حکومتوں نے اشاعرہ کو سرکاری مذہب کیوں قرار دیا؟

عدلیہ کا نظریہ

شیعوں کا نظریہ

امر بین الامرین

اشاعرہ اور معتزلہ کے اعتراضات

خلاصہ

سوالات

عدلیہ کا نظریہ

یہ بات تو معلوم ہو چکی ہے کہ جبر و اختیار والے مسئلہ میں اہل سنّت کے درمیان افراط و تفریط سے لبریز دو نظریئے موجود ہیں۔

اشاعرہ جبر کے قائل ہوئے اور ایسا نظریہ پیش کیا جس کا لازمہ پروردگار کی طرف ظلم کی نسبت دینا ہے۔ معتزلہ اگرچہ شیعوں کے ہمنوا تھے اور خدا کو عادل مانتے تھے لیکن ان کے تفویض والے عقیدہ پر بھی اشکالات وارد ہوتے تھے۔

شیعوں کا نظریہ

شیعوں نے اپنے ائمہ کی پیروی میں، ان دونوں عقیدوں کے درمیان سے ایک معتدل عقیدہ کا اعلان کیا، "لاجبر ولا تفویض بل امر بین الامرین" "نہ جبر ہے نہ تفویض بلکہ امر ان دونوں امروں کے درمیان ہے"۔

اس نظریہ کی وضاحت کے سلسلہ میں ذیل کے نکات پر توجہ فرمائیں ان نکات کی وضاحت سے جبر و تفویض کے ماننے والوں کی لغزشیں آشکار ہو جائے گی:

۱۔ ہم توحید کے تمام مراتب و مدارج سے واقف ہو چکے اور خدا کی حاکمیت مطلقہ اور اس کے فرمان و حکم سے آشنا ہیں، تمام چیزوں کو خدا کے حکم و

وارادہ کارہین منت جانتے ہیں۔

۲۔ کائنات اور انسان پر حاکم سنت امر خدا ہے اور پوری کائنات پر علیت کا قانون جاری ہے کائنات کے ہر وقوعے کی پیدائش قانون علیت اور حکم الٰہی کے لحاظ سے چند علتوں سے وابستہ ہے ان تمام علتوں کے وجود میں آنے سے (کہ جنھیں علت تامہ کہا جاتا ہے) وقوعوں کا وجود ضروری و لازمی ہو جاتا ہے اور اگر ان (علتوں) میں سے ایک نہ ہو تو وقوعہ کا وجود پذیر ہونا محال ہے۔

۳۔ انسان کا چال چلن بھی چند عوامل کا نتیجہ (معلول) ہوتا ہے۔ ان ہی میں سے ایک انسان کا ارادہ ہے اور یہ ارادہ بھی ایک سنت الٰہی ہے یعنی خدا نے چاہا ہے کہ انسان ارادہ کرے۔

امر بین الامرین

انسان جو کام انجام دیتا ہے وہ بھی کائنات کے دیگر مظاہری وقوعوں کی طرح چند عوامل کا نتیجہ ہوتا ہے جو کہ تمام عوامل کے وجود میں آنے سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ ہاتھ، پیر، آنکھ، طاقت، پہلی معلومات اور سب سے زیادہ اہم اس نوشتہ کے مطالعہ کے لئے تمہارا ارادہ ہے، ان عوامل میں سے اگر ایک بھی نہ ہو تو تمہارا کوئی کام بھی انجام پذیر نہ ہو سکے گا۔

انسان کا سادہ اور پاک ادراک اسی بات کی تائید کرتا ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ خدا داد فطرت کے ذریعہ صحت و بیماری بڑائی اور انکساری یا بلند اور پستہ قد ہونے میں فرق محسوس کرتے ہیں۔ ایک کا براہ راست انسان کے

ارادہ اور خواہش سے ربط ہے اور امر و نہی، تعریف و سرزنش کا سبب بنتا ہے۔ لیکن دوسرے میں انسان کا اختیار نہیں ہے۔

اشاعرہ اور معتزلہ کے اعتراضات

اشاعرہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم انسان کے ارادہ اور اختیار کے قائل ہو جائیں تو خدا کی حاکمیت مطلقہ پر حرف آتا ہے لہٰذا انہوں نے انسان کے کاموں کو خدا کے ارادہ سے متعلق کر دیا اور انسان کو مجبور سمجھنے لگے جبکہ اس کا لازمہ خدا کی طرف ناروا امور کی نسبت دینا ہے۔ حالانکہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ انسان کا ارادہ بھی ایک سنت الٰہی ہے اور خدا چاہتا ہے کہ انسان ارادہ و اختیار کا حامل ہو۔ عقل سلیم رکھنے والے پر مذکورہ نظریہ کا باطل ہونا واضح ہے۔ مولوی کہتے ہیں ؎

در خرد جبر از قدر رسوا تر است
زانکہ جبری حس خود را منکر است
منکر حق نیست آن مرد قدر
فعل حق حسی نباشد ای پسر
درک وجدانی بہ جائے حس بود
ہر دو در یک جدول ای عم میرود
اینکہ گوئی این کنم یا آن کنم
این دلیل اختیار است ای صنم

عقل کے اعتبار سے جبر کا عقیدہ اختیار کے عقیدہ سے کہیں برا ہے

کیونکہ جبر کا قائل خود اپنے احساس کا منکر ہے۔
لیکن اختیار کا عقیدہ رکھنے والا حق کا منکر نہیں ہے۔

اے فرزند فعل حسی نہیں ہوتا ہے۔
بلکہ حس کی جگہ عقل درک کرتی ہے۔
دونوں کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔
یہ جو تم کہتے ہو کہ میں اس کام کو انجام دوں یا اس کو،
میرے پیارے یہ بات خود دلیل ہے کہ تم مختار ہو۔

مدمقابل، معتزلہ نے بھی اس نکتہ کی طرف توجہ نہ کی کہ انسان کا ارادہ اور اس کی قدرت و اختیار مادی حالات میں مقید ہیں پھر انسان کا ارادہ اس کے کاموں کو وجود میں لانے کی ایک علت ہے جیسا کہ مذکورہ مثال میں بیان ہوا ہے کہ ہر وقوعہ علل و عوامل کے وجود سے وابستہ ہے اگر وہ علل و عوامل موجود ہیں تو وقوعہ کا وجود ناگزیر ہے۔

ان کے کام بھی وقوعہ کی حیثیت رکھتے ہیں جن کو وجود کا جامہ پہنانے والا انسان کا ارادہ اور اس کے ساتھ کچھ قہری علتیں ہیں، انسان کائنات کا ایک جزو ہے جو کہ وقوعوں کے مجموعہ اور دوسری قہری سنتوں سے مربوط ہے لہٰذا انسان کا عمل ان سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ معتزلہ انسان کو اپنے عمل میں مستقل تصور کرتے ہیں اور اس کے ارادہ کو خدا کی حاکمیت مطلقہ اور اس کے احاطہ ارادہ سے خارج جانتے ہیں حالانکہ اس سے خدا کی حاکمیت مطلقہ پر حرف آتا ہے!

اشاعرہ و معتزلہ کے نظریات کے تجزیہ سے شیعوں کے نظریہ کی صحت

آشکار ہو جاتی ہے جو کہ وحی کے حقیقی ترجمان کے ذریعہ بیان ہوا ہے۔ کیونکہ جبر کے عقیدہ کا لازمہ خدا کی طرف ناروا باتوں کی نسبت دینا ہے اور تفویض، ارادہ کے مستقل وجود کو مستلزم ہے جو کہ خدا کے ارادہ کے برابر ہے۔ اس لئے شیعوں نے اپنے سچے اور معتدل نظریہ کا اس طرح اظہار کیا:

"لَا جَبْرَ وَلَا تَفْوِيْضَ، بَلْ اَمْرٌ بَيْنَ الْاَمْرَيْنِ"

"نہ جبر ہے نہ تفویض بلکہ امر دو امروں کے درمیان ہے۔"

خلاصہ

۱) مسئلہ جبر واختیار میں شیعوں نے معتدل نظریہ کا اعلان کیا کہ جس سے خداوند عالم کے ارادہ وحاکمیت کی معرفت بھی صحیح معنوں میں حاصل ہوتی ہے۔ اس میں خدا کو ان ناروا نسبتوں سے پاک قرار دیا گیا ہے جو کہ اشاعرہ کا نظریہ ہے۔

۲) لوگوں کی صحیح عقل انسان کے ارادی اور غیر ارادی افعال میں فرق محسوس کرتی ہے اور بشر کے ارادہ کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کے کردار کی تخلیق کے سلسلہ میں ارادہ جبری عوامل سے ملا ہوا ہے۔

۳) اشاعرہ انسان کو مجبور قرار دیتے ہیں اور خدا کو اس کے افعال کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور نتیجہ میں ظلم وگناہ بھی خدا کے عمل کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، معتزلہ بھی انسان کے ارادہ کو مستقل سمجھتے ہیں اور یہ خدا کی لامحدود حاکمیت اور اس کے ارادہ کے منافی ہے۔

سوالات

۱) مسئلہ جبر واختیار میں شیعوں کا کیا نظریہ ہے؟

۲) امر بین الامرین کی وضاحت کیجئے۔

۳) جبر کے قائلین کے نظریہ میں کیا نقص ہے۔

۴) معتزلہ کے نظریہ کے سلسلہ میں جو اعتراضات ہیں، انھیں لکھئے۔

٣

نبوّت کی بحث
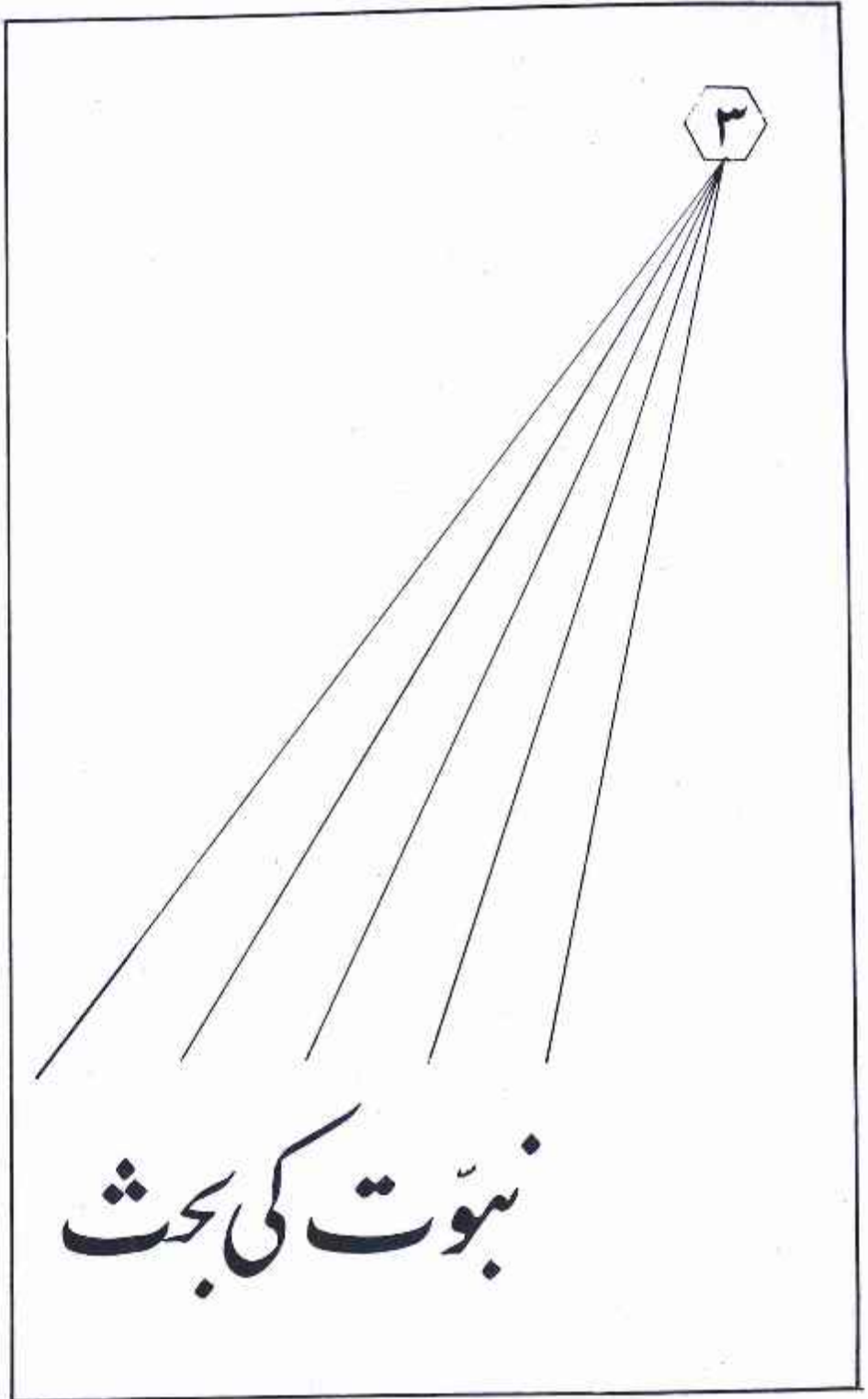
پیغمبروں کے آنے کی ضرورت ۱

- دنیا کی عمومی ہدایت
- مخصوص انسان کی ہدایت
- عقل کی ہدایت
- ان ہدایتوں کی شعاعیں
- پیغمبروں کی ہدایت
- خلاصہ
- سوالات

دنیا کی عمومی ہدایت

کائنات کے تمام وقوعے ایک قسم کی ہدایت سے مالا مال ہیں اور خدا نے جو راستہ ان کے لئے معین کر دیا ہے اسے وہ ٹھہری طور پر طے کر رہے ہیں۔ اس میں ان کا کوئی اختیار نہیں ہے ۔ وہ ایک مخصوص محور کا طواف کر رہے ہیں اس سے ہٹ نہیں سکتے۔ ان کا کہنا ہے:

من اگر خارم اگر گل چمن آرائی ہست ؛ کہ بہ ہر دست کہ او پرودم می رویم

کرۂ زمین اپنے مخصوص و معین محور پر تیزی کے ساتھ سورج کی چاروں طرف گھوم رہا ہے۔ گیہوں کا دانہ مخصوص زمانہ میں زمین میں ڈالا جاتا ہے ۔ وہ رشد و نمو کی منزل طے کرنا شروع کر دیتا ہے ، ہر لحظ وہ نیا روپ دھارتا ہے۔ نظم و ترتیب اور خاص مراحل کے ساتھ اپنے معین راستہ کو طے کرتا ہے یہاں تک خوشہ دار ہو جاتا ہے۔

انسان بھی اسی کائنات کا ایک جزو ہے اور اس کا وجود بھی اس ہدایت کے قلمرو میں ہے ۔ اس کا جسم اس ہدایت کی رہبری میں رشد کرتا ہے اور اپنے پیچیدہ فرائض کو انجام دیتا ہے۔ انسان کا دل بہت ہی دقیق نظم کے تحت کھلتا اور بند ہوتا ہے اور تمام بدن میں خون پہنچاتا ہے ۔ ہاضمہ کی مشنری، تنفس کا نظام، اعصاب کا سلسلہ ، سننے اور دیکھنے کے اعضا ہر ایک اپنا اپنا کام انجام

دیتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی مخصوص ذمہ داری ہے۔

بنابرایں کائنات کے تمام قوے اس ہدایت سے مالامال ہیں اور وہ اپنی کوشش سے اس کشش کا سراغ لگا لیتے ہیں۔

قرآن اس کشش اور راہ پیمائی کو خدا کی طرف نسبت دیتا ہے۔ ارشاد ہے:

رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ

(طہٰ/۵۰)

"ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اس کی ہدایت کی۔"

انسان کی مخصوص ہدایت

خدا نے انسان کو راستہ میں نہیں چھوڑا ہے کہ وہ جبراً راستہ طے کرے بلکہ انسان کو مختار و آزاد بنا کر پیدا کیا ہے تاکہ اپنے کمال کی راہ کو غلط راستوں کے درمیان میں تلاش کرے اور آزادانہ اسے طے کرے، انسان آزاد ہے چاہے وہ رشد و ہدایت اور سیدھے راستہ پر گامزن ہو یا کجروی اور بدبختی کو اختیار کرے۔

لیکن انسان کو اس لئے مخصوص ہدایتوں سے سرفراز کیا ہے تاکہ وہ اپنے ارتقاء اور کمال کی راہ کو پہچان لے اور گمراہی سے بچ کر سعادت مندی کی راہ پر گامزن ہو کر اپنے مقصد کی طرف روانہ ہو جائے۔ یہ مخصوص ہدایت

عقل کی اندرونی ہدایت ہے اور خارج میں پیغمبروں کی ہدایت ہے۔

عقل کی ہدایت

ہم کہہ چکے ہیں کہ عمومی ہدایت انسان کے وجود کے بعض حصہ پر حاکم ہے اور اس عمومی تکوینی ہدایت میں کائنات کے دوسرے موجودات اور انسان مشترک ہیں۔ لیکن انسان کے وجود کا دوسرا حصہ عقل کی ہدایت کے دائرہ میں ہے اور یہ حرکت جو کہ عقل کی راہیابی کے پرتو میں انجام پاتی ہے، یہ آزادانہ اور اختیار سے انجام پاتی ہے۔ جس وقت انسان دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس وقت عقل اس کی راہنمائی کرتی ہے اور غلط راستہ سے ہٹا کر صحیح راستہ پر لگاتی ہے اور نیک کو بد سے جدا کرتی ہے۔ جھوٹ، فساد، خیانت اور ظلم کو برا سمجھتی ہے۔ سچ، نیک منشی، امانت و عدالت کو خوبی اور اچھائی شمار کرتی ہے۔

ان ہدایتوں کی شعاعیں

انسان کی زندگی ان تمام وسیع پہلوؤں کی حامل ہونے کے باوجود ان ہدایتوں کی کشش و رہبری کے احاطہ سے باہر نہیں ہے۔ انسان کی بعض کوششیں غریزہ کی کشش سے انجام پاتی ہیں۔ پیاس لگتی ہے تو پانی کی طرف دوڑتا ہے یا کسی موذی جانور کو دیکھتا ہے تو فرار کرتا ہے۔ اس قسم کے امور طبیعت کے موافق ہیں اور براہ راست لذت و رنج سے ان کا تعلق ہے۔ لذت بخش کام ایک قسم کی کشش ہے جو انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور تکلیف دہ کام ایک قسم کا واقعہ ہے

جوانسان کو اپنے سے دور کرتا ہے ۔ واضح رہے ایسے موارد میں انسان اور دیگر حیوان مشترک ہیں لیکن انسان کے دوسرے وجود کر جزئی عقل کی راہنمائی اور ہدایت کے تحت جاذبہ و دافعہ نہیں ہے ۔ غریزہ نہ انسان کو ان کی طرف کھینچتا ہے نہ ان سے دور کرتا ہے ۔ بلکہ اس مصلحت کی بنا پر جو کہ اس میں مخفی ہے ۔ انسان کی عقل اس کو انجام دینے یا ترک کرنے کا حکم دیتی ہے ۔ اس قسم کے کام نہ فقط طبیعت کے موافق نہیں ہوتے بلکہ لبسا اوقات ان کے انجام دینے میں بہت سی سختیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ ایسے کام انسان کی تدبیر کی فعالیت کا نتیجہ ہوتے ہیں جو کہ عقل کی راہ پائی اور ارادہ سے انجام پاتے ہیں ۔ وہ ان کاموں میں عقلی تدبیر کو غریزہ کی لذت وکشش پر غلبہ دلاتا ہے ۔ ایک بیمار کڑوی اور تلخ دوا پینے سے رنجیدہ ہوتا ہے لیکن عقل کے حکم کے مطابق پیتا ہے ۔

انسان اپنی تدبیری فعالیت میں ہمیشہ ایک منصوبہ کو عملی جامہ پہناتا ہے چنانچہ عقل وارادہ میں جیسے جیسے کمال پیدا ہوتا جاتا ہے اسی تناسب سے اس کی تدبیر کی فعالیت زیادہ ہوتی ہے یہاں تک کہ لذت اندوزی اور غریزہ کی فعالیت تدبیری فعالیت میں منحصر ہوجاتی ہے اور لذتیں بھی مصلحت میں تبدیل ہوجاتی ہیں ۔

پیغمبروں کی ہدایت

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ انسان اجمالی طور پر نیک وبد کو سمجھتا ہے ،

جبری امور میں نیک و بد کی تشخیص کے لئے عقل مفید ہے لیکن یہ ہدایت انسان کو درپیش طولانی اور لاتناہی راستہ کے لئے کافی نہیں ہے۔ عقل کی ہدایت اور اس کی مصلحت جوئی میں زندگی گذارنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایک اندھیری اور طوفان والی رات میں اور بیابان میں معمولی سی روشنی والے چراغ کے سہارے راستہ طے کرنا، ظاہر ہے کہ اس کی روشنی چند قدم ہی کا راستہ دکھائے گی اور ہر لحظہ اس کے بجھ جانے کا خوف رہے گا۔ پیغمبروں کی بعثت اس لئے ہوتی تھی تاکہ وہ عقل کی ہدایت والے سرمایہ کو تقویت دیں اور درماندہ انسان کا ہاتھ پکڑ کر صحیح راستہ پر لگا دیں دوسری طرف، عقل کہ جس کو خواہشات نفسانی چیلنج کرتی رہتی ہیں، اسے ہوا و ہوس کے تند جھکوں کے مقابلہ کے لئے ٹھوس بنائیں۔

"لما بدل اکثر خلقه عهد الله الیهم فجهلوا حقه و اتخذوا الانداد معه و اجتالتهم الشیاطین عن معرفته و اقتطعتهم عن عبادته فبعث فیهم رسله و واتر الیهم انبیائه لیستادوهم میثاق فطرته و یذکروهم منسی نعمته و یحتجوا علیهم بالتبلیغ ویثیروا لهم دفائن العقول و یروهم آیات المقدرة"

(۱، نہج البلاغہ خطبہ ۱)

جب اکثر لوگوں نے عہد خدا کو — جو خداجوئی اور خدا کے رجحان پر مبنی تھا — توڑ دیا اور اس کے حق — عبادت — سے جاہل رہے اور اس کا شریک و مثل قرار دینے لگے اور شیاطین نے اس کی حمد و ثنا سے روگرداں اور اس کی عبادت سے منحرف کر دیا تو خدا نے پیغمبروں کو مبعوث کیا اور یکے بعد دیگرے ان کے پاس بھیجا تاکہ ان سے فطرت کے پیمان پورے کرائیں اور فراموش شدہ نعمت — فطری توحید — انھیں یاد دلائیں۔ دلیل و برہان کے ذریعہ ان سے گفتگو کریں عقل کے دفینوں کو ابھاریں اور انھیں قدرت خدا کی نشانیاں دکھائیں۔"

خلاصہ

1. کائنات کے سارے وجود ایک قسم کی ہدایت سے مالامال ہیں اور خدا نے جو راہ ان کے لئے معین کی ہے، فطری طور پر وہ اسی پر گامزن ہیں۔
2. یہ عمومی ہدایت انسانی پیکر کے حصہ پر حاکم ہے لیکن اس کے دوسرے بعض حصے پر اس کے ارادہ کی حکمرانی ہے لہٰذا انسان آزاد اور مختار ہے جو کہ دوراہے پر کھڑا ہوا ہے۔
3. تاکہ وہ آزادانہ اپنی ترقی کی راہ کو پہچانے اور اس پر گامزن ہو جائے وہ عقل اور پیغمبروں کی ہدایت سے مستفید ہو چکا ہے۔

سوالات

1. کائنات کی عمومی ہدایت کی وضاحت کیجئے۔
2. انسان کتنی ہدایتوں سے بہرہ مند ہے؟
3. عقلی اور غریزی ہدایت کی شعاعیں لکھیے۔
4. التذاذی اور تدبیری فعالیتوں میں کیا فرق ہے؟
5. پیغمبروں کی ہدایت کی وضاحت کیجئے۔

پیغمبروں کے آنے کی ضرورت ۲

- انسانی زندگی کے ابعاد اور عقل کی ہدایت
- عقل بشر کی نارسائی
- ہدایت عقل کے لئے خطرہ
- اس ضرورت کا جبران
- خلاصہ
- سوالات

انسانی زندگی کے ابعاد اور عقل کی ہدایت

قوت عقل و فکر جزئی تدبیروں کے لئے ضروری اور مفید ہے ۔ انسان اپنی فردی زندگی میں ہمیشہ متعدد مسائل سے دوچار رہتا ہے ۔ مثلاً دوست اور زوجہ کا انتخاب اور مسافرت و معاشرت کے مسائل ان تمام چیزوں میں غور و فکر کی ضرورت ہے ۔ کبھی ان امور میں دوسروں کے تجربہ سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے ۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عقل کس حد تک ہدایت کر سکتی ہے ؟ کیا انسان عقل کے ذریعہ ان تمام مسائل کو حل کر سکتا ہے جو تمام موارد میں اس کی ذاتی زندگی میں پیش آتے ہیں ؟

انسان کی زندگی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے ۔ یعنی اجتماعی زندگی گذارنے کا خوگر ہے ، اور اجتماعی زندگی اس کے سامنے ہزاروں مسائل و مشکلات کھڑے کیا کرتی ہے کہ جن کو تدبیر کے ناخن کے ذریعہ حل کرنا چاہئے چونکہ انسان مدنی الطبع ہے ۔ اس لئے اس کی سعادت ، امیدیں اور مصالح دوسروں سے مربوط ہیں دوسروں سے ، الگ ہو کر وہ تنہا اپنی راہ طے نہیں کر سکتا ۔

اگر ہم انسان کی معنوی اور ابدی حیات کو مدنظر رکھیں تو مسئلہ بہت پیچیدہ ہو جائے گا ۔

عقل بشر کی نارسائی

انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور متعدد موقعوں پر پیش آنے والے مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ تمام مشکلات کو عقل کے ذریعہ حل نہیں کیا جاسکتا۔ اس موقع پر ایک جامع دستور العمل اور مکتب کا احساس ہوتا ہے جو کہ انسان کے کمال اور ہر ایک کی سعادت کا ضامن ہو تاکہ وہ انسان کی فردی و اجتماعی زندگی اور حیات ابدی کے لئے کامل و جامع نقشہ پیش کرے۔

خود انسان ایسے مکتب کی بنیاد نہیں رکھ سکتا، کیونکہ بے پناہ مسائل کے مقابلہ میں انسان کے علم و عقل کی مشکل کشائی نہ ہونے کے برابر ہے۔ بشر کا علم و دانش محدود اور نسبی ہے اور مجہولات کے سامنے اس کی معلومات کا دامن بہت تنگ ہے۔

جب انسان کے لئے سب سے بڑا مجہول خود اس کا وجود ہے تو کیا انسانی معاشرہ اور اجتماعی سعادت اس کے لئے مجہول نہیں ہوگی ؟ آج کی دنیا اقتصادی اور اجتماعی لحاظ سے دو مکتبوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔

ان دونوں مکتبوں میں دانشور موجود ہیں جو کہ اپنے مکتب کی حقانیت پر دلیل پیش کرتے ہیں اور اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے انسانی معاشرہ کی سعادت و کامیابی کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔ دوسرے بھی بہت سے مکاتب فکر ہیں جو کہ نئی راہ اور نئے نظریوں کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ان نظری اختلافات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کی محدود عقل ایک مکمل مکتب کو وجود میں لانے

سے قاصر ہے۔ تکمیل، اصلاح اور بشر کے بنائے ہوئے قوانین میں ترمیم کا واقع ہونا اس بات کی بہترین دلیل ہے کہ آدمی انسانی معاشرہ کے کل مصالح و مفاسد کو درک نہیں کر سکتا ہے۔

اس بنا پر انسان کی عقل کی روشنی اور بشر کی دانش کی شعاعوں میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ انسان راستوں کے تمام نشیب و فراز کو بیان کر سکے اور اس کی زندگی کے مصالح و مفاسد کو سمجھا سکے۔

ہدایتِ عقل کیلئے خطرہ

دوسری طرف عقل کی ہدایت ہوا و ہوس کی تند و تیز ہواؤں کی زد پہ ہے انسان کے وجود کا بعض حصہ غرائز کے زیر حکم ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اگر انسان کے غرائز میں اعتدال نہ ہو تو عقل کام نہیں کرتی، انسان کا ایک المیہ یہ ہے کہ فقط اس کی عقل و دانش اس کے ارتقا اور اس کے مخفی رموز کی نشاندھی نہیں کر سکتی۔ بشر کا دوسرا المیہ یہ ہے کہ اگر بالفرض وہ اپنے ارتقا کے بعض اسرار کا سراغ لگا بھی لیتا ہے تو اس کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں ہیں اور اس کے وجود میں ایسی کشش موجود ہے جو اس کو مستقل طور پر سعادت کی راہ سے منحرف کرتی رہتی ہے۔

عقل کی ہدایت انسان کے لئے ایسی ہی ہے جیسے بچے کے لئے باپ کی ہدایت، وہ اپنے بیٹے کو اس لئے پڑھنے کی نصیحت کرتا ہے تاکہ اس کا مستقبل درخشاں ہو جائے۔ بچہ باپ کی نصیحت سنتا ہے اور مدرسہ روانہ ہو جاتا ہے

لیکن راستہ میں بچوں کو کھیل کود میں مشغول دیکھ کر خود بھی بستہ رکھ دیتا ہے اور کھیل میں مشغول ہو جاتا ہے اور باپ کی تمام باتوں کو فراموش کر دیتا ہے، کیا خیانت کرنے والے جھوٹ بولنے والے ،مفسد اور قتل کرنے والے اپنے کام کی برائیوں کو نہیں جانتے ہیں ؟ یا جانتے ہیں لیکن ہوا و ہوس کی پیروی کرتے ہیں ؟

اس ضرورت کا جبران

انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے ارتقاء کے سفر کو آزادانہ طور پر طے کرے اور ارادہ کے تحت اپنے مقصد کی طرف بڑھے لیکن انسان کی محدود عقل اس راہ کے تمام نشیب و فراز سے ناآشنا ہے اور اس کی مختصر معلومات بھی آسیب پذیر ہیں اس صورت میں ایک طاقت کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے جو کہ عقل کو تمام مسائل کے حل کرنے کی طاقت عطا کرے جو، فردی و اجتماعی اور اخروی زندگی میں درپیش ہیں اور اس کے بعد غرائز کی سرکش طاقت کے مقابلہ میں ٹھوس بنا دے۔

الٰہی تصور کائنات کے لحاظ سے، ہستی کا نظام ایک متعادل نظام ہے کہ جس میں خلل نہیں ہے۔ اس بنا پر رب العالمین نے اس ضرورت کو بھی پورا کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے اور وحی کے ذریعہ بشر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جامع اور کامل طور پر معین کیا ہے اور آدمی کی عقل کو کج روی سے بچانے اور اس کو ترقی دینے کے لئے پیغمبر بھیجے ہیں۔

بوعلی نے اپنی کتاب "نجات" میں انسان کو شریعت الٰہی کی ضرورت ہے، کی اس طرح وضاحت کی ہے :

"نوع انسانی کی بقا اور اس کے کمال تک پہنچنے کے لئے شریعت الٰہی اور پیغمبروں کی احتیاج ابرو پر بال اگانے اور پاؤں کے تلووں کو گہرا بنانے سے بھی زیادہ ضروری ہے ایسے ہی اور منافع ہیں جو نوع انسانی کی بقاء کیلئے مفید ہیں اگرچہ بقاء نوع میں ان کی ضرورت نہ ہو"

پس جب خدا نے معمولی اور غیر ضروری حاجتوں کو بھی پورا کر دیا، تو اہم ترین چیزوں کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا جو کہ انسان کی زندگی کا مقصد ہے اور اس کا تعلق اس کی فردی و اجتماعی زندگی کی سعادت سے ہے[۱]؟

امام رضاؑ سے منقول ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ لوگوں پر انبیاء کی معرفت ان کی نبوت کا اقرار اور ان کی طاعت کا تعین کیوں واجب ہے؟ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ ان خلقت میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے جو کہ ان کے مصالح کو پورا کر سکے اور خدا کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا وہ اس سے منزہ ہے۔ کہ بندے اپنے مصالح کو براہ راست اس سے

---

[۱] عن الرضا علیہ السلام، فان قال: فلم وجب علیھم معرفۃ الرسل والاقرار بھم والاذعان لھم بالطاعۃ؟ قیل: لانہ لما لم یکن فی خلقھم وقواھم مایکملوا لمصالحھم وکان الصانع متعالیا عن ان یریٰ وکان ضعفھم وعجزھم عن ادراکہ ظاھرا لم یکن بد من رسول بینہ و بینھم معصوم یودّی الیھم امرہ ونھیہ وادبہ ویقفھم علی ما یکون بہ احراز منافعھم ودفع مضارھم، اذلم یکن فی خلقھم مایعرفون بہ مایحتاجون الیہ منافعھم ومضارھم . . .

حاصل کرتے ۔ اور اس کے ادراک کے سلسلہ میں لوگوں کی ناتوانی واضح ہے، پس خدا اور لوگوں کے درمیان ایک معصوم پیغمبر واسطہ ہو جو کہ انھیں امر ونہی ، واجبات، محرمات، مستحبات اور مکروہات بتائیے نیز نفع وضرر سے آگاہ کرے۔ کیونکہ ان کی خلقت میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے جو کہ انھیں نفع وضرر سے آگاہ کرے۔[1]

عقلوں کی توانائی اور اس کے پرتو کو منور کرنے کے لئے پیغمبر آتے ہیں اور انسان کو غرائز و شہوت اور غضب کو قابو میں رکھنے کا سلیقہ سکھاتے ہیں تاکہ اس کی عقل ہوا و ہوس سے مغلوب نہ ہو اور اس کا نور خاموش نہ ہو جائے۔ عقل اس کی تقویت شدہ روشنی کو تقویٰ کے حصار میں قرار دیتے ہیں اور شہوت کی منہ زوریوں کو لگام چڑھاکر انسان کے اختیار میں دیدیتے ہیں تاکہ وہ انسان کے عظیم مقصد کے حصول میں مدد کر سکے۔

[1] بحار الانوار ج ۱۱ ص ۴۰ ، علل الشرائع ص ۹۵ عیون الرضا ص ۲۲۹

خلاصہ

۱) انسان ذاتی و فردی اور اجتماعی زندگی میں اور ضروریات حیات سے رابطہ کے سلسلہ میں بہت سے مسائل سے دوچار ہوتا ہے، اسے ایک مکمل و جامع نقشہ کی ضرورت ہے جو کہ اس کی زندگی کی تمام مشکلات کو حل کر سکے۔

۲) قوت عقل اور نسبی دانش دو خصوصیتوں، نارسائی اور غیر محفوظ ہونے کی بنا پر انسان کو اس کے مقصد تک نہیں پہنچا سکتی۔

۳) الٰہی تصور کائنات کی رو سے ہستی کا نظام ایک معتدل نظام ہے اور جس طرح خدا نے انسان کی زندگی میں مؤثر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کو بھی پورا کیا ہے اسی طرح اس کی اہم ضرورت کو بھی پیغمبروں پر وحی کے ذریعہ پورا کر دیا ہے۔

سوالات

۱) انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیجئے۔

۲) ہدایت عقل کی نارسائی بیان کیجئے۔

۳) ہدایت عقل، خطرات کی آماجگاہ ہے، کی وضاحت کیجئے۔

۴) کیا انسان پیغمبر اور وحی کا محتاج ہے؟ کیوں؟

۵) کیا خدا نے انسان کی اس ضرورت پر توجہ کی ہے؟

وحی سے متعلق

- وحی کیا ہے ؟
- وحی کی قسمیں
- وحی تمام لوگوں پر کیوں نہیں نازل ہوتی ؟
- خلاصہ
- سوالات

وحی سے متعلق

گزشتہ اسباق میں ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ انسان کی زندگی تین پہلوؤں، فردی، اجتماعی اور اخروی سے تشکیل پائی ہے اور انسان ایسے منصوبہ اور دستور العمل کو حاصل کرنے کی فکر میں ہے کہ جو اس کے مصالح کو زندگی کے تمام پہلوؤں میں پورا کر سکے۔

انسان کی محدود عقل و دانش ایسا دستور العمل اور منصوبہ پیش کرنے سے یہاں تک اس کی فردی زندگی کے سلسلہ میں بھی، قاصر ہے چہ جائیکہ اجتماعی اور اخروی زندگی کے لئے کوئی نقشہ پیش کر سکے جو کہ پیچیدہ مسئلہ ہے جس طرح مبداء تخلیق نے دنیا کے ہر موجود کے اندر ان کی تقدیر و طبیعت رکھی ہے اسی طرح انسان کی فطرت میں بھی پیام ہدایت رکھا ہے۔

پیغمبر وہ بلند مرتبہ انسان ہیں کہ جن کا تعلق مبداء ہستی سے رہتا ہے اور اس کے ان فرامین کو لے کر انسان کے اختیار میں دیتے ہیں جو کہ بشر کی دنیوی اور اخروی زندگی کی سعادت و کامیابی کے ضامن ہیں۔

وحی کیا ہے؟

وحی کے معنی عجلت میں، راز دارانہ بات کرنے کے ہیں، وہ بات جو مخفی

طور پر اشاروں میں اس طرح کی جائے کہ مخاطب "وحی لینے والا" اس کے مفہوم کو سمجھ جائے اور بھیجنے والے کے مقصد سے آگاہ ہو جائے۔ پیغمبر اپنی مخصوص استعداد سے براہ راست وحی کے پیغاموں کو مبدا خلقت سے لیتے ہیں یہ پیغامات ایسے روشن اور نور بخش سنے والے ہیں کہ پیغمبروں کے پورے وجود کو منور کر دیتے ہیں اور ان پردہ حقائق آشکار کر دیتے ہیں جو ہم سے پوشیدہ ہیں۔

پیغمبران روشن پیغاموں کے ذریعہ کچھ حقائق نبوت سے باخبر ہوتے ہیں تاکہ دوسروں تک خدا کا پیغام پہنچائیں۔ یہ پیغام اولاً ان ہی کے قلب پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں اور ان کی اندرونی طاقت کو جلا بخشتے ہیں اور ان کے باطن میں ایک عظیم انقلابی قوت پیدا کر دیتے ہیں، ایسا انقلاب جو تعمیری اور ثمر بخش ہو جس کو اجتماعی ماحول میں برپا کیا جاتا ہے۔

وحی کی قسمیں

قرآن کے نقطہ نظر سے وحی انسانوں ہی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ بعض موارد میں کائنات کے تمام موجودات کی طبیعی اور غریزی ہدایت کو بھی وحی کہا گیا ہے، اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وحی کے بھی کچھ مدارج و مراتب ہیں اور ان میں بلند ترین مرتبہ اس وحی کا ہے جو پیغمبروں پر نازل ہوتی ہے اور ان کے سایہ میں انسان کی آگاہانہ اور آزادانہ ہدایت ہوتی ہے۔ وحی کی یہ قسم کہ جس میں خدا انسان سے رابطہ برقرار کرتا ہے۔ اور پیغمبر کے لئے پیغام بھیجتا ہے اسے قرآن میں تین صورتوں میں بیان کیا گیا ہے:

وما کان لبشر ان یکلمه اللہ الا وحیا او من وراء
حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ ما
یشاء انہ علیّ حکیم (شوریٰ / ۵۱)

"اور کوئی شخص اس مقام پر فائز نہیں ہو سکتا کہ خدا اس سے بات کرے مگر یہ کہ وحی کے ذریعہ یا پردہ کے پیچھے سے یا کسی رسول کو بھیجے اور وہ اپنے اختیار سے جو چاہتا ہے پیغام بھیجتا ہے، بے شک وہ بلند مرتبہ اور حکمت والا ہے۔"

۱۔ خداوند عالم وحی کے ذریعہ پیغمبروں کو بلا واسطہ کچھ حقائق سمجھاتا رہتا ہے۔

۲۔ بالواسطہ رابطہ۔ اس میں خداوند عالم بالواسطہ پیغمبروں پر پیغام نازل فرماتا ہے۔ لیکن وہ خدا کی طرف سے رسالت کے لئے معین نہیں ہیں، مثلاً جناب موسیٰ سے گفتگو کے وقت درخت میں آواز پیدا کرنا۔

۳۔ بالواسطہ رابطہ، جیسا کہ فرشتہ کے ذریعہ وحی آتی تھی۔

تمام لوگوں پر وحی کیوں نہیں نازل ہوتی؟

ممکن ہے کہ یہ سوال اٹھایا جائے کہ اگر عقل کی ہدایت انسان کے لئے کافی نہیں ہے اور بشر اس بات کا محتاج ہے کہ وہ اپنی زندگی کا جامع دستور العمل وحی کے ذریعہ خدا سے حاصل کرے تو کیا ضروری ہے کہ اس پیغام کے لئے پیغمبر واسطہ بنیں؟ کتنا اچھا ہوتا کہ تمام انسان خدا سے ارتباط پیدا کر سکتے اور اپنی

زندگی کا دستور العمل بلاواسطہ خدا سے لیتے اور تمام انسان وحی سے مستفید ہوتے ؟

جواب : تمام انسانوں کا وحی سے مستفید ہونا اور ہر شخص کا اپنا پیغمبر ہونا ممکن نہیں ہے ۔ کیونکہ ہر ایک انسان میں وحی کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے ، بلکہ وحی کے بارہ کو برداشت کرنے کے لئے انسانوں سے ممتاز پیغمبروں کو بھی سالہا سال ریاضت کرنا پڑتی تھی اور تہذیب نفس راز و نیاز کے لئے اپنے پرائوں سے علیحدگی ناگزیر تھی جب سالہا سال کے بعد ان کے اندر یہ لیاقت پیدا ہو جاتی تھی تب فرشتہ ان پر وحی لے کر نازل ہوتا تھا اور خدا کا نوید بخش پیغام پہنچاتا تھا ۔

چونکہ تمام انسانوں میں وحی کے بار کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے اور دوسری طرف عقل انسانی بھی ان کی راہبری کے لئے کفایت کناں نہیں ہے ۔ اس لئے ضروری ہے کہ خدا کی طرف سے پیغمبری کے لئے وہ اشخاص منتخب ہوں جو کہ تہذیب نفس ، خود سازی ، تقوی اور بار وحی کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں وہ انسان کی ہدایت کے پیغام کو خدا سے لیں اور لوگوں تک پہنچائیں ۔

خلاصہ

① وحی کے معنی تیز اور سری گفتگو کے ہیں۔ پیغمبر وحی کے ذریعہ خدا سے رابطہ قائم کرتے ہیں اور خدا سے انسان کی ہدایت کا پیغام لیتے ہیں۔

② قرآن میں وحی کو انسان سے تین صورتوں میں مخصوص قرار دیا گیا ہے۔ خدا سے براہ راست ارتباط، بالواسطہ خدا سے ارتباط، اس واسطہ کو رسالت کا نام نہیں دیا جاتا بالواسطہ ارتباط کہ جس میں وحی کا واسطہ فرشتہ ہے۔

③ تمام لوگوں میں بار وحی کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، خدا انسان کی ہدایت کے پیغام کو ان برگزیدہ لوگوں کے ذریعہ، جو کہ تہذیب نفس میں بہت آگے ہیں اور ان میں اس کام کی قوت جلوہ گر ہے، لوگوں تک پہنچاتا ہے۔

سوالات

① وحی کیا ہے؟

② نبوت، رسالت اور بعثت سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

③ کیا قرآن میں وحی کو انسان سے مخصوص کیا گیا ہے؟

④ جو وحی انسان سے مخصوص ہے اس کے خصوصیات بیان کیجئے۔

⑤ سب پر وحی کیوں نازل نہیں ہوتی؟

پیغمبروں کے معجزات

- معجزہ
- معجزہ کے شرائط
- معجزہ اور سحر کا فرق
- خلاصہ
- سوالات

پیغمبروں کے معجزات

گزشتہ سبق میں ہم نے وحی سے متعلق اور مبداء ہستی سے پیغمبروں کے ارتباط کی طرف اشارہ کیا تھا اور یہ بھی بیان کیا تھا کہ تمام پیغمبر خدا سے انسان کی ہدایت کے پیغام حاصل کرتے ہیں اور لوگوں تک پہنچانے کی ذمہ داری انہی کی ہے۔ وہ لوگوں کے درمیان آتے ہیں اور خالقِ کائنات سے اپنے ارتباط کا اعلان کرتے ہیں۔

چونکہ وحی ایسا رابطہ نہیں ہے کہ جس کا ادراک سارے انسان کر سکیں لہٰذا پیغمبر کو چاہئے کہ وہ خدا سے اپنے اس رابطہ پر واضح و روشن گواہ پیش کرے اور لوگ بھی اُن سے ان کے دعوے کی حقانیت کے سلسلہ میں ثبوت مانگتے ہیں، یعنی پیغمبر کوئی ایسا کام انجام دے کہ جس کو دوسرے افراد انجام نہ دے سکیں صرف پیغمبر ہی اسے اس لئے انجام دے سکتا ہے کہ اس کا مبداء ہستی سے ارتباط ہے۔

امام جعفر صادق فرماتے ہیں:

"عن الصادق (ع): والمعجزۃ علامۃ للہ لا یعطیھا الاّ انبیائہ ورسلہ وحججہ لیعرف بہ صدق الصادق من کذب الکاذب۔"

(بحار الانوار، ج ۱۱، ص ۰)

"معجزہ وہ چیز ہے جسے خدا صرف اپنے پیغمبروں، رسولوں اور اپنی حجتوں کو عطا کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ نبوت کے سچے دعویدار جھوٹے دعویداروں سے پہچان لئے جائیں۔"

معجزہ

معجزہ عجز سے مشتق ہے جیسے کہا جاتا ہے: "عجز فلان عن العمل" یعنی فلاں شخص کام سے عاجز ہو گیا۔

اس بنا پر معجزہ خارق العادہ فعل ہے جسے صرف پیغمبر ہی انجام دیتے ہیں اور عام لوگوں کو اس کے ذریعہ عاجز و ناتواں بنا دیتے ہیں۔ پیغمبر حکم خدا سے اپنے ارتباط اور اپنے دعوے کی حقانیت کے لئے معجزہ دکھاتے ہیں قرآن مجید معجزہ کو نبوت کی دلیل قرار دیتا ہے اور اسلامی علوم کے ماہرین اسے معجزہ کہتے ہیں کہ اسے دیگر افراد انجام دینے سے قاصر ہیں۔

خدا کی طرف سے جو پیغمبر بھی مبعوث ہوتا ہے وہ خارق العادہ قوت کا حامل ہوتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ حکم خدا سے ایک یا چند ایسے افعال انجام دے سکے کہ جنہیں عام افراد انجام نہ دے سکیں۔ قرآن کہتا ہے کہ لوگ اپنے زمانہ کے پیغمبر سے معجزہ کا مطالبہ کرتے تھے اور پیغمبر بھی اس منطقی و معقول بات کو قبول کرتے تھے اور اس کا مثبت جواب دیتے تھے لیکن اگر معجزہ کے مطالبے میں حق کی تلاش کے علاوہ لوگوں کی کوئی اور غرض ہوتی تھی جیسا کہ

پیغمبر اکرم سے کہا گیا کہ اگر آپؐ ہمارے لئے ایک سونے کا پہاڑ بنادیں، کہ جس کے ذریعہ ہم باسانی مالدار ہو جائیں گے تو ہم آپ کی بات کو تسلیم کریں گے پیغمبر نے ان کی بات کو ٹھکرا دیا۔[1]

معجزہ کے شرائط

ہر وہ خارق العادہ فعل جو پیغمبر کے خدا سے رابطہ کی دلیل بن سکتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اولاً وہ ممکن ہو یعنی غیر ممکن اور محال امور سے معجزہ کا تعلق نہیں ہے۔ مثلاً اگر لوگ کہیں ہمیں خدا کا دیدار کرادیجئے، چونکہ خدا کا دیدار محال و ناممکن ہے۔ اس لئے ایسے افعال کی انجام دہی کا مطالبہ کرنا عبث ہے۔ معجزہ بذات خود ممکن فعل ہے لیکن اس کی انجام دہی عام لوگوں کے قبضہ کی بات نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ پیغمبر لوگوں کو تحدّی (چیلنج) کر رہے ہوں یعنی یہ کہہ رہے ہوں کہ خدا کے حکم سے میں جو کام انجام دے رہا ہوں اگر طاقت ہے تو تم بھی انجام دے کر دکھاؤ۔

---

[1] قرآن مجید نے معجزہ کے سلسلہ میں پیغمبر اور مشرکین کی ایک گفتگو بھی نقل کی ہے: وقالوا لن نومن لک حتیٰ تفجر لنا من الارض ینبوعاً او تکون لک جنة من نخیل وعنب فتفجر الانہار ..... قل سبحان ربّی ھل کنت الا بشراً رسولاً (اسراء/۹۰)

معجزہ اور سحر میں فرق

بعض لوگ حیرت انگیز کام انجام دیتے ہیں کہ جنھیں لوگ غیر عادی سمجھنے لگتے ہیں۔ ان لوگوں کے افعال اور پیغمبر کے معجزہ میں فرق ہے۔

۱۔ ساحروں کا کام فنی عمل ہوتا ہے جو کہ صرف بعض ناآگاہ لوگوں کے لئے فنی پہلوؤں کے باعث انوکھا اور نیا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن پیغمبروں کا معجزہ ہر ایک انسان کے لئے انوکھا اور جدید ہوتا ہے۔

۲۔ معجزہ تحدّی کے وقت دکھایا جاتا ہے اور پیغمبر یقین کے ساتھ فرماتے ہیں کہ دوسرے لوگ ایسا کام انجام نہیں دے سکتے جبکہ ساحر و جادوگر ایسا دعویٰ نہیں کرتے۔

۳۔ ساحروں کا کام مشق و ریاضت کا نتیجہ ہے جب کہ پیغمبروں کا معجزہ مشق و ریاضت کا رہین منت نہیں ہے بلکہ وہ خارق العادہ فعل انجام دیتے ہیں۔

۴۔ ساحروں کا کرتب ایک مہارت ہے یعنی وہ چند محدود امور میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں جبکہ خدا کے پیغمبر گوناگوں قسم کے خارق العادہ کام انجام دیتے تھے۔

خود پیغمبروں کے معجزات کے درمیان جو فرق ہے اس کا سبب ہر زمانہ کے لوگوں کے اجتماعی افکار تھے۔ ہر زمانہ کے افراد کا فکر و فن جدا تھا اور

معاشرہ کی توجہ بھی اسی فن کی طرف ہوتی تھی۔ پیغمبروں نے ہمیشہ ان کی اسی توجہ سے فائدہ اٹھایا اور ان کے افکار کو قابو میں کر کے ان کی صحیح سمت کا تعین کیا ہے۔

حضرت موسیٰ کے زمانہ میں لوگوں کی توجہ سحر پر مرکوز تھی اس لئے جناب موسیٰ نے وہ معجزہ دکھایا جو کہ عمومی توجہ کا مرکز تھا۔ لہٰذا انہوں نے اپنا عصا زمین پر ڈالدیا، دیکھتے ہی دیکھتے وہ اژدھا بن گیا۔ حضرت عیسیٰ نے مردوں کو زندہ کیا اور مادر زاد اندھوں کو بینائی عطا کی کیونکہ ان کے زمانہ میں طبابت و ڈاکٹری ہی کو فروغ تھا اور لوگوں کی توجہ اسی پر مرکوز تھی۔

پیغمبر اسلام کے زمانہ میں لوگ شعر و ادبیات اور اس کی باریکیوں سے دلچسپی رکھتے تھے جزیرۃ العرب کے تمام شعراء مکہ میں جمع ہوتے تھے اور گرماگرم مشاعرہ کا انعقاد کرتے تھے اور بہترین اشعار کو خانہ کعبہ میں معلق کر دیتے تھے اسی ماحول میں رسولؐ نے خدا کی طرف سے قرآن پیش کیا اور اعلان کیا کہ اگر تم کو اس کے کلام خدا ہونے میں شک ہے، جو کہ ہم نے اپنے بندہ پر نازل کیا ہے تو تم بھی اس جیسا ایک سورہ لے آؤ۔[1]

---

[1] ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فأتوا بسورۃ من مثلہ (بقرہ/۲۳)

خلاصہ

۱) معجزہ خارق العادت فعل ہے۔ عام لوگ اس کی انجام دہی سے عاجز ہیں اور خدا کے پیغمبر حکم خدا سے اپنے دعوے کی حقانیت کے ثبوت کے لئے معجزہ دکھاتے ہیں۔

۲) معجزہ اور سحر کے درمیان یہ فرق ہے کہ ساحروں کا کام ایک مہارت ہے جو کہ اکثر مشق و ریاضت کا رہین منت ہوتا ہے اور ان لوگوں کے لئے جدید و انوکھا ہوتا ہے جو کہ فنی پہلوؤں سے آگاہ نہیں ہوتے جبکہ معجزہ ایسا نہیں ہے

۳) پیغمبروں کے معجزات کے درمیان بھی فرق ہے لیکن اس کا سبب ہر زمانہ کے لوگوں کی عمومی فکر کا ارتکاز ہے کیونکہ ہر زمانہ کی اجتماعی فکر کا ایک مخصوص موضوع ہوتا ہے اور پیغمبر اپنے الہی مقصد میں لوگوں کی توجہ ہی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

سوالات

۱) معجزہ کیا ہے ؟

۲) معجزہ کے لئے کیا چیز ضروری ہے ؟

۳) معجزہ کے شرائط بیان کیجئے۔

۴) سحر و معجزہ میں کیا فرق ہے ؟

۵) پیغمبر کس کی درخواست کے تحت معجزہ دکھاتے تھے ؟

۶) پیغمبروں کے معجزوں کے درمیان فرق کیوں ہے ؟

پانچواں سبق

پیغمبروں کی عصمت

- عصمت کیا ہے؟
- گناہ سے بچاؤ
- اشتباہ سے محفوظ
- پیغمبروں اور نابغہ افراد میں فرق
- پیغمبر کیوں معصوم ہوتے ہیں؟
- خلاصہ
- سوالات

عصمت

عصمت یعنی گناہ و اشتباہ سے محفوظ رہنا پیغمبر نہ گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں نہ اپنے کاموں میں اشتباہ سے دوچار ہوتے ہیں، ان کی گناہ اور اشتباہ سے پاکیزگی انھیں اعتماد کی اعلی قابلیت عطا کرتی ہے۔

اب ہم یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ان کے گناہ سے پاک رہنے کی وجہ کیا ہے؟ کیا ان میں گناہ اور اشتباہ کی قوت و صلاحیت ہی نہیں ہوتی جیسے فرشتوں میں یہ صلاحیت نہیں ہے؟ یا جس وقت وہ (معاذ اللہ) گناہوں کے مرتکب ہونا چاہتے ہیں تو اس وقت ایک غیبی طاقت آکر، اس باپ کی طرح جو بیٹے کو غلط کام سے روکتا ہے، انھیں روک دیتی ہے؟

جواب: پیغمبروں کی عصمت نہ ایسی ہے کہ ان میں گناہ کی صلاحیت و طاقت نہیں ہے اور نہ ہی خارج سے کوئی چیز آکر انہیں گناہ سے باز رکھتی ہے بلکہ انکی نظر اور ایمان و یقین کا نتیجہ ہے۔

گناہ سے بچاؤ

انسان ایسا موجود ہے جو آزاد و مختار ہے وہ نفع و ضرر یا کسی مصلحت کی بنیاد پر کوئی کام انجام دیتا ہے یا ترک کردیتا ہے اس لحاظ سے آگہی اور نیک و بد کی تمیز اس کے انتخاب میں اہم

مقام رکھتی ہے۔

ایمان اور آثار گناہ کے اعتبار سے لوگوں میں تفاوت ہے۔ جس کا ایمان جتنا قوی ہوگا اور جس کی گناہ کے نقصان پر زیادہ توجہ ہوگی اتنا ہی وہ گناہوں سے پرہیز کرے گا یعنی اتنا ہی وہ گناہوں سے پاک ہوگا اگر اس کا ایمان یقین کی حد تک پہنچ گیا ہے، اس طرح کہ جب وہ گناہ کا ارتکاب کرنا چاہتا ہے تو خود کو ایسا محسوس کرتا ہے جیسے پہاڑ سے گر رہا ہو یا زہر ہلاہل پی رہا ہو تو اس صورت میں گناہ کے ارتکاب کا احتمال صفر میں ہوگا۔ یعنی ہرگز گناہ کی طرف نہیں بڑھے گا۔ جس طرح ایک عام انسان خود کو پہاڑ سے گرانے اور زہر ہلاہل پینے سے روکتا ہے اسی کیفیت کو ہم عصمت کہتے ہیں۔

پس گناہ سے محفوظ رہنے کا سرچشمہ ایمانِ کامل اور بہترین تقویٰ ہے ظاہر ہے کہ جو انسان عصمت کے درجہ تک پہنچتا ہے اس کے لئے ضروری نہیں ہے کہ کوئی خارجی طاقت آکر اسے گناہ سے باز رکھے یا اس کی فطرت میں گناہ کا محرک ہی نہ ہو۔ اگر کسی انسان میں گناہ کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو تو اس کے لئے گناہ نہ کرنا کمال شمار نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو قیدخانہ میں ہے اور چوری کرنے پر قادر نہیں ہے کیا ایسے انسان کو، جو چوری نہ کر سکے، صحیح کہا جا سکتا ہے اور اس کے پاس امانت رکھی جا سکتی ہے؟

اس بیان سے پیغمبروں کے وجود میں عصمت کا امکان واضح ہو جاتا ہے لیکن عصمت کی حقیقت شاید کچھ اور ہی شئی ہے۔ درحقیقت پیغمبروں کی

عصمت کا درجہ اس سے کہیں بلند ہے جو کہ بیان ہوا ہے۔ عابدوں کی عبادت کے سلسلہ میں ایک روایت نقل ہوتی ہے جس میں جنت کی طمع میں کی جانے والی عبادت کو تاجروں کی عبادت اور جہنم کے خوف میں انجام پانے والی عبادت کو غلاموں کی عبادت قرار دیا گیا ہے لیکن آزاد لوگوں کی عبادت نہ شوق جنت میں ہوتی ہے نہ خوف جہنم میں بلکہ خدا سے محبت وعشق کی وجہ سے انجام پذیر ہوتی ہے۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

"ایک جماعت نے خدا کی محبت وعشق میں اس کی عبادت کی سو وہ آزاد لوگوں کی عبادت ہے اور وہی سب سے افضل عبادت ہے"[۱۱]

اس روایت سے اور دیگر روایات سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ پیغمبروں کی عصمت کا تعلق عقلی تخمینوں سے نہیں ہے بلکہ وہ اس سے کہیں بلند ہیں، وہ معصوم ہیں کیونکہ وہ خدا سے عشق ومحبت رکھتے ہیں۔ اگر انسان کے دل میں شعلۂ عشق بھڑک اٹھتا ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ معشوق کی مرضی کے خلاف قدم نہیں اٹھاتا ہے بلکہ اس کی وہی مرضی ہوتی ہے جو اس کے معشوق کی ہوتی ہے یہاں تک کہ اس کے خلاف قدم نہیں اٹھاتا ہے بلکہ اس کی وہی مرضی ہوتی ہے جو اس کے معشوق کی ہوتی ہے یہاں تک کہ اس کے خلاف تصور بھی نہیں کرتا ہے وہ ہمیشہ اطاعت میں رہتا ہے اور معصیت کی راہ ہرگز اختیار نہیں کرتا۔

جن مردان خدا کے دلوں میں اس کی محبت کا شرارہ ہوتا ہے۔ ان کے

سلسلہ میں ایسی ایسی حکایات و داستان موجود ہیں کہ جنھیں سن کر انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ ایسی ہی چیزوں نے انھیں خدا کے حکم کا مطیع و عبادت گذار بنایا ہے خدا کے پیغمبروں کی تو بات ہی اور ہے ان کے وجود میں یہ عشق رچا بسا ہوا ہے اور ان کا دل اسی میں جل رہا ہے۔

اشتباہ سے محفوظ

اشتباہ سے تحفظ کا سر چشمہ پیغمبروں کی بینش ہے۔ اشتباہ سے انسان وہاں دو چار ہوتا ہے جہاں براہ راست حقیقتوں کو ملاحظہ نہیں کرتا ہے بلکہ ذہنی طور پر کم و بیش ان سے آشنا ہوتا ہے۔ مثلاً: اگر ہم تسبیح کا ایک دانہ ایک ظرف میں ڈال دیں اس کے بعد دوسرا دانہ اور اسی کام کو سو بار انجام دیں تو یہ سو دانے ہوں گے نہ کم نہ زیاد لیکن حساب کے لحاظ سے ممکن ہے کہ ہمارا ذہن اشتباہ سے دوچار ہو جائے اور یہ خیال پیدا ہو کہ ۹۹ (ننانوے) دانے ڈالے ہیں یا ایک سو ایک بار یہ عمل انجام پذیر ہوا ہے۔ اس صورت میں حساب کرنے والا ہمارا ذہن اشتباہ سے دوچار ہو جائے گا۔ لیکن حقیقت ایک ہی ہے خدا کے پیغمبر وحی کے ذریعہ کائنات کی حقیقت سے ارتباط رکھتے ہیں اور حقیقت سے آگہی کے بعد اشتباہ نہیں ہوتا ہے۔

پیغمبروں اور نابغہ افراد میں فرق

یہیں سے پیغمبروں اور نابغہ لوگوں کے درمیان فرق کو محسوس کیا جا سکتا

ہے۔ نابغہ وہ افراد ہیں جن کی فکری قوت قوی ہوتی ہے، یعنی اپنے حواس سے اشیاء کو محسوس کرتے ہیں اور عقلی توانائی کے ذریعہ اس کا ذہنی تجزیہ کرتے ہیں اور نیا نتیجہ نکالتے ہیں کبھی خطاسے دوچار ہوتے ہیں لیکن خدا کے پیغمبر اپنی فکر و صلاحیت اور ذہنی تخمینوں کے علاوہ ایک دوسری طاقت یعنی وحی کے حامل ہوتے ہیں، نابغہ کا نبوغ انسانی فکر و نظر سے مربوط ہے لیکن پیغمبروں کی امتیازی طاقت وحی سے مربوط ہے جو کہ کائنات کی حقیقت سے ان کا رابطہ قائم کراتی ہے۔

پیغمبر کیوں معصوم ہوتے ہیں؟

پیغمبر لوگوں کی ہدایت، معاشرہ کو گناہوں سے بچانے اور عدالت و تقویٰ کے فروغ کے لئے آئے ہیں، لوگوں کو ان پر اعتماد کرنا چاہئے اور اطمینان سے انکی باتوں کو سننا چاہئے جب لوگ انھیں ان کے قول کے خلاف عمل کرتے دیکھیں گے جبکہ لوگوں کو صداقت، امانت اور تقویٰ و عدالت کی دعوت دیتے ہوں گے اور خود دوسروں کے حقوق کو پامال کرتے ہوں گے اور گناہوں سے آلودہ ہوں گے یا لوگ ان کے بارے میں گناہ کا احتمال دیتے ہوں گے تو مرکز اطمینان قلب کے ساتھ انکی باتوں کو نہیں سنیں گے اور ان کی باتیں کانوں سے آگے نہیں بڑھیں گی۔

لوگوں کے دل میں اپنی بات اتارنے اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے پیغمبروں کی پوری زندگی کو نیکیوں اور پاکیزگی سے مملو ہونا چاہئے۔

خلاصہ

۱. پیغمبر نہ گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور نہ اپنے کاموں میں اشتباہ سے دوچار ہوتے ہیں۔ گناہوں سے تحفظ کا سرچشمہ ان کے ایمان اور یقین کے اعلا درجے پر فائز ہونا ہے اور اشتباہ سے محفوظ رہنے کا منبع وہ مخصوص شناخت ہے جو انھیں کائنات کی حقیقت سے مرتبط کرتی ہے۔

۲. پیغمبروں اور نابغہ لوگوں کے درمیان یہ فرق ہے کہ نابغہ اپنے حواس اور قوی ذہانت سے نیا نتیجہ نکالتے ہیں لیکن پیغمبر اپنی فکری طاقت کے علاوہ وحی کے بھی حامل ہوتے ہیں۔

۳. پیغمبروں کا معصوم ہونا انہیں قابل اعتماد بناتا ہے اور لوگ اطمینان قلب کے ساتھ ان کی دعوت کو قبول کرتے ہیں۔

سوالات

۱. عصمت کیا ہے؟
۲. گناہ سے تحفظ کا سرچشمہ کیا ہے؟
۳. اشتباہ سے تحفظ کا منبع کیا ہے؟
۴. پیغمبروں اور نابغہ لوگوں کے درمیان کیا فرق ہے؟
۵. پیغمبروں کی عصمت کا لازمہ کیا ہے؟

پیغمبروں کو پہچاننے کے طریقے

- معجزہ
- گزشتہ پیغمبروں نے آنے والے پیغمبروں کی خبر دی ہو
- گواہ اور نشانیاں

۱- اندرونی محرکات

۲- مقصد کے حصول میں فداکاری

۳- اجتماعی حالات،

۴- مکتب کی تعلیمات اور اس کے تربیت یافتہ افراد

- خلاصہ
- سوالات

الف - معجزہ

گزشتہ بحثوں میں ہم نے معجزہ کے بارے میں کچھ مطالب بیان کئے تھے، آپ معجزہ کی حقیقت اور سبب و شرائط سے آشنا ہو چکے ہیں۔ معجزہ اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ صاحب معجزہ نبوت کا مدعی ہے اور وہ اپنے دعوے میں سچا ہے، درحقیقت اس کا دوسرے عالم سے ارتباط ہے اس سلسلہ میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔

خداوند عالم نے انبیا اور ان کے جانشینوں کو معجزہ عنایت کیا ہے تاکہ معجزہ ان کے دعوے کا سچا گواہ قرار پائے۔ معجزہ وہ علامت ہے جس کو خدا صرف اپنے پیغمبروں، رسولوں اور اپنی حجتوں کو عطا کرتا ہے تاکہ اس معجزہ کے ذریعہ وہ جھوٹے دعویداروں سے ممتاز ہو جائیں[1]۔

اس بنا پر معجزہ پیغمبر کے مبدا ہستی سے ارتباط کا گواہ ہے، تمام پیغمبروں کے معجزات وقتی تھے یعنی ان ہی کے زمانہ تک محدود تھے لیکن پیغمبر اسلامؐ کا معجزہ وقتی ہونے کے ساتھ ساتھ دائمی بھی ہے۔

پیغمبرؐ کے وقتی معجزات وہ ہیں جو کہ ایک شخص یا ایک گروہ کی درخواست پر دکھائے۔ ایک مرتبہ قریش نے مکہ میں پیغمبر سے معجزہ کی درخواست کی پیغمبرؐ

---

[1] بحار الانوار ج ۱۱/ ص ۷۱

نے چاند کی طرف اشارہ کیا تو چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ یہ معجزہ شق القمر کے نام سے مشہور ہے، ایسے ہی اور بہت سے معجزات آپؐ کی زندگی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

آپ کا دائمی معجزہ قرآن ہے اور اس معجزہ کے دائمی ہونے کا ربط آپؐ کے مکتب و پیغام اور دائمی دعوت سے ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ صرف پیغمبر اسلام کا معجزہ جاودانی ہے کیونکہ آپؐ کی شریعت و رسالت دائمی ہے پس جس پیغمبر کی رسالت عالمی اور شریعت جاودانی ہے اسے ایسا معجزہ پیش کرنا چاہئے کہ جو ہمیشہ کام آئے۔

ب۔ گزشتہ پیغمبروں نے آنے والے پیغمبروں کی خبر دی ہو

پیغمبروں کو پہچاننے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پہلے پیغمبر نے بعد میں آنے والے پیغمبر کی خبر دی ہو اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ جس گھر میں آپ سکونت پذیر ہیں وہ میرا ہے۔ میرا نام و پتہ سند میں لکھا ہوا ہے تو اس دعوے کو ثابت کرنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ سند کو لوگوں کے سامنے یا عدالت میں پیش کرے اور یہ ثابت کرے یہ شخص جھوٹ بولتا ہے۔ لیکن اگر آپ سند پیش کرنے کی بجائے چیخنا چلانا شروع کر دیں اور کسی طرح سند دکھانے پر تیار نہ ہوں تو لوگ کس طرح فیصلہ کریں گے؟ کیا وہ سند پیش نہ کرنے اور ان تمام برائیوں کو برداشت کرنے کو مدعی کی حقانیت پر گواہ نہیں سمجھیں گے۔؟

پیغمبر اسلام آئے اور اعلان کیا: میں وہی پیغمبر ہوں جس کا نام تورات

دانجیل میں بیان ہوا ہے یہودیوں نے لڑنا شروع کر دیا اور مسیحیوں نے نقصان برداشت کر لیا ۔ مگر اپنی آسمانی کتاب کو پیش نہ کیا ۔ لیکن یہ جو دشمنان اسلام نے جنگ اور نقصانات برداشت کئے ہیں ان سے ہم سمجھتے ہیں کہ پیغمبر کا نام اور علامت ان کی کتابوں میں موجود تھا ۔ قرآن نے متعدد آیتوں میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے :

واذ قال عیسی ابن مریم یا بنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم مصدقا لما بین یدی من التوراۃ ومبشراً برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد فلما جاءھم بالبینات قالوا ھذا سحر مبین۔

(صف / ٦)

" اور اس وقت کو یاد کرو جب عیسیٰ بن مریم نے کہا : اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں اپنے پہلے کی کتاب تصدیق کرنے والا ہوں اور اپنے بعد ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں جس کا نام احمدؐ ہے لیکن جب وہ (احمد) معجزات لے کر آئے تو گوں نے کہا یہ تو کھلا ہوا جادو ہے ۔"

ج ۔ گواہ اور نشانیاں

پیغمبروں کو پہچاننے کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ایسی علامتیں تلاش کی جائیں

جو کہ ان کے نبوت کے دعوے کو سچا ثابت کر دیں۔ یہ ایسا طریقہ ہے جو واضح، آسان اور سب کے لئے ممکن ہے۔

۱۔ اندرونی محرکات

نبوت کے مدعی کی نفسیاتی خصوصیات کی تحقیق کی جائے۔ دعوائے نبوت سے قبل لوگوں کے درمیان ان کی زندگی کو دیکھا جائے، جاہ و مقام اور مال و دولت سے اس کی دلچسپی اس بات کو روشن کرے گی کہ کیا اس کو خدائی محرکات اور الٰہی ذمہ داریوں نے اس دعوے پر مجبور کیا ہے یا اس دعوے کے کچھ اور اسباب ہیں۔ پیغمبروں کی تاریخ خصوصاً پیغمبر اسلام کی تاریخ اس بات کو واضح کرتی ہے کہ الٰہی محرکات کے علاوہ اور کوئی عامل نہ تھا۔

پیغمبر اسلام امی تھے، بکریاں چراتے تھے اور لوگ انہیں ان کی امانت داری کی بنا پر امین کہتے تھے۔ آپ نے خدیجہ کی بے پناہ دولت کو اسلام کی ترویج اور محروموں کی نجات میں خرچ کر دیا، جب آپ کے چچا ابوطالب نے آپ کے سامنے قریش کا پیغام نقل کیا کہ اگر تم دعوت اسلام دینا چھوڑ دو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ تسلیم کر لیں گے اور حسین ترین لڑکی سے شادی کر دیں گے اور مال و دولت کے ڈھیر لگا دیں گے تو پیغمبرؐ نے جواب دیا:

"قسم خدا کی اگر میرے ایک ہاتھ پر آفتاب اور دوسرے ہاتھ پر مہتاب بھی لا کر رکھ دیں گے تو بھی میں دعوت اسلام سے دست کش نہ ہوں گا۔"

آپؐ کی زندگی میں ایسے بہت سے موڑ آئے جن میں ہر طرف سے آپؐ کی

امید منقطع ہو چکی تھی لیکن چشم زدن کے لئے بھی آپؐ نے شکست کا تصور نہیں کیا۔ یہ پائیداری اور اپنی جگہ اٹل رہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپؐ کی دعوت کا محرک صرف الٰہی ذمہ داری تھی۔

۲۔ مقصد کے حصول میں فداکاری

پیغمبرؐ نے اپنے کو نہ صرف اپنے مکتب کے دستورات سے مستثنٰی نہیں کیا بلکہ ہمیشہ سب پہلے انھیں انجام دیتے تھے اور خدا کے آئین کی ترقی کے لئے خود کو بھول جاتے تھے اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دیتے تھے واقعۂ مباہلہ اس کا واضح ثبوت ہے۔ پیغمبرؐ نے نجران کے مسیحیوں کو یہ دعوت دی کہ یا دین اسلام کو قبول کریں یا ملت اسلامیہ کے آئین کو تسلیم کریں۔ مسیحیوں کے نمائندے آنحضرت سے مذاکرہ کرنے کی غرض سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن طویل مذاکرات اور روشن دلیلوں کے باوجود انہوں نے آپؐ کو نبی تسلیم نہ کیا۔ آخر کار مباہلہ پر نوبت پہنچی۔ اس سلسلہ میں قرآن فرماتا ہے:

فمن حاجك من بعد ما جائك من العلم فقل تعالوا ندع ابنائنا ابنائكم و نسائنا ونسائكم وانفسنا وانفسكم ثم نبتهل فنجعل لعنت الله على الكاذبين۔

(آل عمران / ۶۱)

جب آپ کے پاس علم آچکا اگر اس کے بعد بھی کوئی آپ سے

(عیسیٰ کے بارے میں) حجت کرے تو آپ کہہ دیجئے کہ ہم اپنے بیٹوں کو اور تم اپنے بیٹوں کو ہم اپنی عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو، ہم اپنے مردوں کو اور تم اپنے مردوں کو ساتھ لے کر مباہلہ کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں۔"

طرفین مجادلہ کو مباہلہ کے ذریعہ ختم کرنے کی تیاری میں مشغول ہو گئے مباہلہ سے قبل نجران کے سرداروں کی کمیٹی والوں نے ایک دوسرے سے کہا جب محمدؐ اپنے افسروں اور سپاہیوں کو میدان مباہلہ میں لائیں گے اور ہمیں مادی شان و شوکت دکھائیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ ان کے پاس (معاذ اللہ) ایمان نہیں ہے اور اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ لیکن اگر اپنے بیٹوں اور عزیزوں کے ساتھ مباہلہ کے لئے آئیں گے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے۔ وہ حقیقی پیغمبر ہیں اور ان کے بقول صاحب ایمان ہیں جو کہ خود کو اور عزیزوں کو بھی اس راہ میں قربان کر دینا چاہتے ہیں۔

ان کی یہ گفتگو ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ پیغمبرؐ امام حسینؑ کو آغوش میں لئے ہوئے حضرت امام حسنؑ کا ہاتھ حضرت علی پکڑے ہوئے اور حضرت علیؑ و زہراؑ آپؐ کے پیچھے پیچھے تھے اس طرح میدان مباہلہ میں قدم رکھا جب نجران نے یہ کیفیت دیکھی تو سب نے متفق ہو کر مباہلہ سے دست کشی اختیار کی اور جزیہ دینے پر تیار ہو گئے۔[1]

---

[1] واقعہ کی تفصیل فروغ ابدیت ج ۲ ص ۸۱۶ پر ملاحظہ فرمائیں

۳۔ اجتماعی حالات

پیغمبر ان معاشروں میں مبعوث ہوتے تھے کہ جن کے افراد کے دلوں پر جہل و نادانی، خرافات و بت پرستی طاری ہوجاتی تھی اور لوگوں پر ظلم و ستم بڑھ جاتا تھا۔ دشمنی اور عبث و فضول کینہ توزی کا دور دورہ ہوتا تھا، قتل و غارت گھری اور فسادات کو فروغ ہوتا تھا اور داداگری اور خیالی جاہ طلبی کی حکومت ہوتی تھی۔

ایسے زمانہ میں جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں خدا کی طرف سے آیا ہوں اور لوگوں کو صلح و آشتی، نیکی و پاکیزگی، عدالت و مساوات کی طرف بلائے اور جہاں ستمگری کا ہی رواج ہو اور طبقات فکری کا دور ہو وہاں عدالت کی آواز بلند کرے مساوات و اخوت کی طرف دعوت دے اور شرک، خرافات پرستی اور تفرقہ و جہل کی دنیا میں توحید کا منادی بنے اور لوگوں کو تحصیل علم، محبت اور وحدت کی طرف بلائے۔

۴۔ مکتب کی تعلیمات اور اس کے تربیت یافتہ افراد

سچے آسمانی مذاہب نے ہمیشہ لوگوں کو نیکی اور سچائی کی طرف دعوت دی ہے۔ پیغمبروں کی تعلیمات میں مختصر غور و فکر سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اجتماعی ماحول اس فکر کو جنم نہیں دے سکتا ہے، اس کا رابطہ دوسری دنیا سے ہے کہ جس نے ان تمام تاریکیوں اور تباہیوں کے درمیان ایسی تعلیمات

کو وجود دیا ہے، خصوصاً قرآن نے کہ جس میں مختلف حیرت انگیز پہلو ہیں اور سراسر معجزہ ہے۔

جنہوں نے اس مکتب میں تربیت پائی ہے ان میں سے ہر ایک ایمان و تقویٰ کا نمونہ ہے۔ علیؑ وخدیجہ اور فاطمہؑ ہی اخلاص کے نمونے تھے، یہاں تک کہ اسلام سے قبل بھی ان کے چہروں سے عظمت و پاکیزگی نمایاں تھی، ابوذرؓ مقداد، سلمان، بلال وغیرہ ایسے لوگوں نے ان ہی تعلیمات کے سایہ میں پرورش پائی ہے۔ ان علامتوں کے مجموعہ سے خاتم المرسلینؐ کی نبوت کی صداقت کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

خلاصہ

۱. نبوت کے مدعی کی صداقت کو تین طریقوں سے پہچانا جاسکتا ہے: ۱- معجزہ ۲- پہلا پیغمبر آنے والے کی خبر دے ۳- گواہ اور نشانیاں۔

۲. معجزہ مبدأ ہستی سے پیغمبر کے ارتباط کا پتہ دیتا ہے۔ قرآن پیغمبر اسلام کا دائمی معجزہ ہے اور چونکہ پیغمبر اسلام کی شریعت عالمی اور دائمی ہے لہذا آپ کا معجزہ بھی دائمی ہے۔

۳. اندرونی محرکات کی تحقیق اور اجتماعی حالات سے ایک پیغمبر کے پیروکاروں کی تعلیمات و شخصیت کا پتہ ملتا ہے، کیا پیغمبر کو ابھارنے والا محرک خدائی ذمہ داری تھی یا دوسری چیزیں، سبب تھیں۔

سوالات

۱. پیغمبروں کو پہچاننے کے طریقہ بیان کیجیے۔
۲. پیغمبروں کے وقتی اور دائمی معجزہ کی وضاحت کیجیے۔
۳. کیا توراۃ و انجیل میں پیغمبر اسلام کا نام بیان ہوا ہے؟
۴. جن معاشروں میں انبیاء مبعوث ہوتے تھے ان کے کیا حالات تھے؟
۵. الٰہی مکاتب کا اتباع کرنے والوں اور ان کی تعلیمات کی وضاحت کیجیے۔

ساتواں سبق

ختمِ نبوّت

- مسلمانوں کا نظریہ
- نبوّتوں کی تجدید کے اسباب :
  - ۱۔ عقل انسان کی نارسائی اور آسمانی کتب میں تحریف
  - ۲۔ عقل انسان ایک کامل و جامع دستور العمل مرتب نہیں کر سکتی
- تبلیغی و تشریعی نبوت
- خلاصہ
- سوالات

مسلمانوں کا نظریہ

مسلمانوں کے نقطہ نظر سے مسئلہ ختم نبوت ایک امر مسلم ہے اور ان کے درمیان کبھی یہ مسئلہ نہیں اٹھا کہ حضرت محمدؐ کے بعد کوئی دوسرا پیغمبر آئے گا قرآن نے واضح طور پر اعلان کیا اور بارہا فرمایا ہے کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے مسلمانوں کا نظریہ ہے کہ دوسرے پیغمبر کی آمد کا یقین رکھنا ایسا ہی ہے جیسے خدا کی وحدانیت یا قیامت کا انکار، یہ فکر ہمیشہ ایمان اسلام کے ناموافق رہی ہے اور علوم اسلامی کے دانشوروں کی کوشش صرف اس فکر کی گہرائی اور اس کے راز کو سمجھنے میں صرف ہوئی ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

ما کان محمد ابا احد من رجالکم
ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین۔

(احزاب/۴۰)

"محمدؐ تم میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں وہ تو خدا کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں۔"

خاتم اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی کام کو انجام تک پہنچاتی ہے۔ چنانچہ اس مہر کو بھی خاتم کہتے ہیں جو خط بند کرنے کے بعد لگائی جاتی ہے اور چونکہ انگوٹھی کے نگین پر نام یا اشعار کندہ ہوتے تھے اور اسی کو خط پر

لگا دیتے تھے لہٰذا اسے بھی خاتم کہا جانے لگا۔

آیت کے تیور بتا رہے ہیں کہ اس آیت کے نزول سے قبل ختم نبوت کی اطلاع پیغمبرؐ کے ذریعہ لوگوں کے درمیان گشت کر رہی تھی اور جس طرح لوگ محمدؐ کو رسول اللہ سمجھتے تھے اسی طرح آپؐ کو خاتم النبیین بھی سمجھتے تھے۔

یہ آیت صرف اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ انہیں کسی (زید بن حارثہ) کا باپ کہہ کر نہ پکارو بلکہ آپ کے حقیقی لقب "رسول اللہ یا خاتم النبیین" سے یاد کرو[۱]۔

ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ جب بشر وحی کا محتاج ہے تو پھر سلسلہ نبوت کو ختم نہیں ہونا چاہئے؟ اس سوال کے جواب کے لئے ضروری ہے ہم نبوتوں کی تجدید کی طرف اشارہ کریں۔

نبوتوں کی تجدید کے اسباب

۱۔ عقل انسانی کی نارسائی اور آسمانی کتب میں تحریف

نئے پیغمبروں کے مبعوث ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ پہلے پیغمبروں کی آسمانی

---

[۱] عرب اور بعض قوموں کی ایک رسم یہ تھی کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنا لیتے تھے چنانچہ اس منہ بولے بیٹے کو وہ حقوق ملتے تھے جو حقیقی بیٹے کے ہیں۔ اسلام نے اس رسم کو منسوخ قرار دیدیا پیغمبرؐ کے یہ آزاد کردہ زید بن حارثہ کو بھی آپ کا بیٹا کہا جاتا تھا لہٰذا لوگ رسم کے مطابق اس انتظار میں تھے کہ زید کے ساتھ پیغمبر وہی سلوک روا رکھیں گے جو حقیقی بیٹے کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ لیکن اس آیت نے جاہلیت والی رسم کو رد کر دیا۔

کتب کے دستورات و تعلیمات میں تحریف ہو جاتی تھی ، وہ کتابیں اور تعلیمات لوگوں کی ہدایت کے لائق نہیں رہتی تھیں ۔ انسان میں علمی آثار کی حفاظت اور خدا کے قانون و شریعت کی نگہبانی کی طاقت نہیں ہے ۔ اس لئے ہدایت آمیز آسمانی تعلیمات میں انحراف و کجی پیدا ہو جاتی تھی چنانچہ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون

"ہم ہی نے اس کتاب (قرآن) کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے ۔" (حجر/۹)

یہ آیت نزول قرآن کے زمانہ ہی سے نبوتوں کی آئندہ تجدید کی نفی کر رہی ہے ۔ آسمانی کتابوں میں صرف قرآن وہ کتاب ہے جس میں کوئی تحریف نہیں ہوتی ہے ۔ اس بنا پر (خاتمیت) انسانی فکر و عقل کے رشد کا ایک پایہ اپنے علمی و دینی آثار کی حفاظت کرنا ہے ۔

۲۔ عقل انسان ایک کامل وجامع دستور العمل مرتب نہیں کرسکتی

ہم جانتے ہیں کہ انسان وحی کا محتاج ہے تاکہ وہ اس کی زندگی کے تمام پہلوؤں کے لحاظ سے ایک جامع و کامل قانون پیش کرے ۔ ابتدا میں انسان فکری ارتقاء کے فقدان کی بنا پر اس کلی قانون کو حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا اور ان قوانین کی راہ نمائی میں اپنا راستہ طے کرنا بھی نہیں جانتا تھا لہذا ضروری تھا کہ منزل بہ منزل اس کی راہنمائی کی جائے ۔ انسان اپنے ارتقاء میں اس قافلہ کی طرح ہے جو کہ ایک مقصد کی طرف گامزن ہے لیکن راستہ سے واقف نہیں

سے ممکن ہے اسے کوئی ایسا آدمی مل جائے جو راستہ سے واقف ہو اور اس سے علامات لکھ کر دسیوں کیلومیٹر کا راستہ طے کرے، یہاں تک کہ ایسی جگہ پہنچ جائے کہ جہاں نئے راہبر کی ضرورت پیش آتی ہے اس نئے رہبر سے معلومات فراہم کرنے کے بعد اس کے سامنے نئے افق روشن ہوں اور رفتہ رفتہ اس کی معلومات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جائے اور اس شخص تک رسائی ہوگی کہ جس سے راستہ کا کامل نقشہ حاصل کرے اور اس نقشہ کی وجہ سے نئے راہنماؤں سے بے نیاز ہو جائے ۔

اس مثال سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ پیغمبر اسلام کی رسالت تمام رسالتوں سے مختلف ہے۔ یہ تفاوت قانون و منصوبہ کی نوعیت کا ہے۔ پہلے پیغامات ایک مخصوص گروہ اور مخصوص زمانہ کے لئے ایک وقتی پروگرام تھا لیکن اسلام انسانیت کا بنیادی قانون ہے۔

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جس میں انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا حل موجود ہے۔ گزشتہ پیغمبروں پر مخصوص ذمہ داری تھی اور ایک معاشرہ کے لئے خدا نے انھیں مخصوص دستور دیئے تھے، ان ہی ذمہ داریوں کو علمائے امت اور رہبر انجام دیتے ہیں فرق یہ ہے کہ علماء و رہبر اسلامی وحی ختم نہ ہونے والے منابع سے اور اجاودانہ دین سے قانون بناتے ہیں اور نافذ کرتے ہیں۔

تبلیغی اور تشریعی نبوت

نبوت کی دو قسمیں ہیں۔ تشریعی اور تبلیغی، تشریعی پیغمبروں کی تعداد بہت

کم ہے یہ وہ پیغمبر ہیں جو خدا کی طرف سے انسانوں کے لئے دستور العمل و قانون لائے۔ اکثر تبلیغی پیغمبر ہیں یعنی اس زمانہ کی آسمانی شریعت کی تبلیغ کرتے تھے۔

گزشتہ توضیحات سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسان فکری ارتقاء کی وجہ سے اپنی زندگی کا جامع اور مکمل پروگرام حاصل کر سکتا ہے۔ لہٰذا اب تشریعی نبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی عقل و فکر کے رشد سے انسان اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ اب اپنی زندگی کے دستور کو کلی قانون کے مطابق مرتب کرے اور اپنے دین کی تبلیغ و تعلیم اور تفسیر و اجتہاد کا حامل بن جائے چنانچہ اب تبلیغی نبوت کی بھی ضرورت ہے۔

اس بنا پر ختم نبوت کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان وحی سے بے نیاز ہو گیا ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب انسان میں مکمل نظام و قانون کو حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ اس کلی قانون کے پرتو میں، کہ جس کا سرچشمہ وحی ہے، اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے لئے ایک پروگرام بنا سکتا ہے اور اس طرح وہ ہمیشہ وحی کا محتاج رہے گا۔

خلاصہ

① ختم نبوت کو مسلمان امر مسلم تصور کرتے ہیں چنانچہ قرآن مجید نے بھی بارہا واضح طور پر اس کا اعلان کیا ہے۔ اور علوم اسلامی کے دانشوروں کی کوششیں اس بات پر صرف ہوتی ہے نیز اس کی گہرائی کی شناخت اور رموز کی معرفت حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہیں۔

② نبوتوں کی تجدید کی ایک وجہ پیغمبروں کی تعلیمات میں تحریف کا واقع ہونا ہے۔ فکری ارتقاء کی وجہ سے انسان اپنے علمی و دینی آثار کی حفاظت نہیں کر سکتا۔

③ انسان نے فکری ارتقاء کے بعد اپنی راہ کے مکمل نقشہ کو حاصل کر لیا ہے اور اس کلی پروگرام سے اپنے لئے دستور بنا سکتا ہے۔ چنانچہ اب تشریعی نبوت کی ضرورت نہیں ہے اور چونکہ اس میں تفسیر و اجتہاد کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے لہٰذا تبلیغی نبوت کی بھی ضرورت نہیں رہی ہے

سوالات

① ختم نبوت کے بارے میں مسلمانوں کا کیا نظریہ ہے؟
② خاتم کے کیا معنی ہیں؟
③ تجدید نبوت میں تحریف کے کردار کو بیان کیجئے۔
④ کیا ختم نبوت کے معنی وحی سے بے نیاز ہونا ہے؟
⑤ پیغمبر اسلام اور دیگر رسولوں کی رسالت میں کیا فرق ہے؟
⑥ تبلیغی و تشریعی نبوتوں کی تعریف بیان کیجئے۔

آٹھواں سبق

قرآن دائمی معجزہ

- اعجاز قرآن
- قرآن کے اعجازی پہلو
- الفاظ قرآن
- معنی قرآن
- خلاصہ
- سوالات

قرآن دائمی معجزہ

اعجاز قرآن

قرآن پیغمبر اسلام کا دائمی معجزہ ہے۔ پیغمبروں کے درمیان صرف پیغمبر اسلام کا معجزہ دائمی اور جاویداں ہے۔ دوسرے پیغمبروں کے معجزات وقتی اور ان ہی کے زمانہ سے مخصوص تھے۔

قرآن مجید نے اپنے اعجازی پہلوؤں کو بارہا بیان کیا ہے اور تمام انسانوں کو چیلنج کیا ہے۔ یہاں تک کہدیا ہے کہ تم قرآن جیسی کتاب لے آو تاکہ وہ اس کام کی کوشش کریں اور انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اس کام سے عاجز ہیں۔

جس معاشرہ میں شعر و شاعری اور ادب کا رواج ہو اور سال بھر مکہ میں شعر و شاعری کے سلسلہ میں محافل و مقابلہ رہتا ہو وہاں قرآن سب کو چیلنج کر رہا ہے لیکن کوئی مقابلہ میں نہیں آتا۔ جو لوگ قرآن کے سخت دشمن تھے کیا وہ قرآن کا جواب لانے سے قاصر و عاجز نہ تھے؟ اگر عاجز نہ تھے تو کیسے خاموش بیٹھے رہے؟ ان کی آخری بات یہ تھی کہ قرآن سحر ہے انکی یہ بات خود قرآن کے معجزہ ہونے اور اس کے مقابل میں ان کی عاجزی کا اعتراف ہے

قرآن کے اعجازی پہلو

قرآن مختلف جہات سے معجزہ ہے، فوق انسانیت ہے۔ لیکن ایک تقسیم بندی

کے تحت کہا جا سکتا ہے کہ قرآن دو جہت سے معجزہ ہے ، لفظی و معنوی ، ایک فنی اور زیبائی کے اعتبار سے اور دوسرے فکری اور شناخت کے لحاظ سے البتہ ان پہلوؤں میں سے ہر ایک مختلف وجوہ سے قابل تحقیق و دقت ہے ۔

الفاظ قرآن

قرآن کا اسلوب عبارت نہ شعری ہے نہ نثر ، شعر اس لئے نہیں ہے کہ اس میں وزن و قافیہ نہیں ہے اس کے علاوہ شعر میں ایک قسم کا شاعرانہ تخیل ہوتا ہے اور اغراق گوئی پر اس کی بنیاد قائم ہوتی ہے جو کہ ایک قسم کا جھوٹ ہے ۔ لیکن قرآن مجید میں شاعرانہ تخیل ، خیالی تشبیہ نہیں ہے ، اس کے ساتھ ساتھ معمولی نثر بھی نہیں ہے کیونکہ ایسا انسجام اور آہنگ ہے کہ ابھی تک کسی نثر میں نہیں دیکھا گیا ہے ۔

دینی دستورات میں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ خوش الحانی سے قرآن کی تلاوت کیا کرو ۔ ائمہ اطہار کبھی اپنے گھر میں اس خوش لحن و دلکش انداز میں قرآن کی تلاوت فرماتے تھے کہ راستہ چلنے والوں کے قدم روک جاتے تھے کوئی نثر بھی قرآن کی طرح آہنگ پذیر نہیں ہے وہ آہنگ جو روحانی دنیاؤں کے موافق ہے اور تعجب خیز چیز تو یہ ہے کہ قرآن کی زیبائی نے زمان و مکان کو منور کر دیا ہے ۔ بہت سی دل پذیر باتیں ہیں لیکن ایک زمانہ سے مخصوص ہیں اور دوسرے زمانہ والوں کی نظروں میں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے ۔ یا ان کی خوبصورتی و زیبائی ایک قوم سے مخصوص ہے لیکن قرآن کی زیبائی بلا تفریق ،

قوم وخاص ملت کی ثقافت سے مخصوص نہیں ہے۔

تاریخ اسلام میں ایسے بہت سے افراد گذرے ہیں جو قرآن کے مقابلہ میں آئے ہیں۔ ان میں سے بعض کو عربی زبان میں خدائے سخن سمجھا جاتا لیکن انہوں نے خود کو حقیر اور عظمت قرآن ہی کو ثابت کیا ہے۔

دوسرا تعجب خیز نکتہ یہ ہے کہ خود پیغمبر کا کلام، جن کی زبان پر قرآن جاری ہوا، قرآن سے مختلف ہے پیغمبرؐ کے کلام کا اکثر حصہ خطبوں، دعاؤں اور حکمت آمیز کلمات کی صورت میں موجود ہے جو کہ اسلوب و آہنگ کے اوج پر ہے لیکن اس میں کسی طرح بھی قرآن کا رنگ و ڈھنگ نہیں، علیؑ قرآن کے ساتھ پلے بڑھے تھے، حافظ قرآن تھے ہمیشہ اس کی تلاوت فرماتے تھے لیکن جب آپ کے کلام کے ضمن میں کہیں قرآن کی کوئی آیت آجاتی تو وہ ممتاز ہی نظر آتی ہے اور اس ستارے کی طرح نظر آتی ہے جو تمام ستاروں سے زیادہ روشن و درخشاں ہوتا ہے۔

معنیٔ قرآن

بلند معانی و مفاہیم کے لحاظ سے اعجاز قرآن کے لئے ایک طویل بحث درکار ہے۔ ہم اس مختصر کتاب میں سرسری طور پر اس کی تصویر کشی کر رہے ہیں اور تفصیل کے شائقین کے لئے تفصیلی کتابوں کا حوالہ پیش کر رہے ہیں اولاً ہمیں یہ جاننا چاہئے کہ قرآن کس نوعیت کی کتاب ہے؟ کیا وہ فلسفہ کی کتاب ہے؟ یا علمی و تاریخی کتاب ہے؟ کیا فنی اثر کے ساتھ ایک ادبی تحریر ہے؟

جواب یہ ہے کہ، ان میں سے قرآن کچھ بھی نہیں ہے، بالکل ایسے ہی جیسے پیغمبروں کی شخصیت جدا تھی، وہ نہ فلسفی تھے، نہ عالم و ادیب تھے نہ مورخ و ہنرمند تھے، اس کے باوجود ان کے خصوصیات کو بہترین طریقہ سے جانتے تھے، قرآن بھی، علمی، فلسفی، تاریخی یا ادبی کتاب نہیں ہے لیکن دوسرے امتیازات کے ساتھ یہ خصوصیات بھی اس میں بدرجہ اتم موجود ہیں، قرآن انسان کے لئے کتاب ہدایت ہے، حقیقت میں کتاب انسان ہے۔ خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے اور پیغمبر اس لئے آئے ہیں تاکہ اسے خود اس کی معرفت کرائیں اور اس کی سعادت و کامرانی کا راستہ بتائیں۔

جو کچھ انسان علوم کے ذریعہ پہچانتا ہے وہ اس سے کہیں مختلف ہوتا ہے جسے مکتب وحی بیان کرتا ہے۔ علوم جس انسان کا تعارف کراتے ہیں وہ دو بریکٹ "پیدائش و موت" کے درمیان کی چیز ہے اس سے پہلے اور بعد کی منزل تاریک ہے یہ علوم بھی سطحی اور محدود ہیں، جبکہ وحی کے نقطہ نظر سے انسان کو ان ہی چیزوں میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ وحی انسان کو عالم خاکی میں دیکھتی ہے اور دنیا کو ایسا مدرسہ سمجھتی ہے کہ جس کی تگ و دو کا تعلق اس دنیا سے ہے۔

قرآنی انسان کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟ کہاں ہے؟ کیا ہونا چاہئے؟ کیا کرنا چاہئے؟

دونوں جہانوں میں انسان کی حقیقی سعادت و سرفرازی، اس میں ہے کہ کہ ہر ایک عمل کو صحیح طریقہ سے انجام دیتا رہے۔

انسان کو یہ جاننے کے لئے کہ وہ کہاں سے آیا ہے۔ اپنے خدا کو پہچاننا چاہیئے اور خدا کو پہچاننے کے لئے کائنات اور انسان کا "آفاقی و انفسی" آیات و نشانیوں کے لحاظ سے مطالعہ کرنا چاہیئے[1]۔ اور یہ جاننے کے کہ کہاں جارہا ہے آئندہ کے انسان و جہان، معاد اور جس کو قرآن نے بازگشت کا نام دیا ہے، میں غور کرنا چاہیئے اور جس طرح تمام موجودات کا سرچشمہ خدا کو جانتا ہے اسی طرح ان کا منتہی بھی خدا ہی کو سمجھنا چاہیئے۔

اور یہ جاننے کے لئے کہ کہاں ہے۔ کائنات کی معرفت حاصل کرنا چاہیئے اور موجودات کے درمیان اپنی حیثیت کا ادراک کرنا چاہیئے موجودات کے درمیان سے خود کو ممتاز کرنا چاہیئے۔

اور یہ جاننے کے لئے کہ کیا کرنا چاہیئے، فردی و اجتماعی احکام کا پابند ہونا چاہیئے اور خدا نے جو احکام بشر کی ہدایت کے لئے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ بھیجے ہیں ان پر عمل کرنا چاہیئے۔

---

[1] قرآن انسان سے باہر کی چیزوں کو آفاق اور اس کی داخلی کائنات کو انفس کہتا ہے۔

خلاصہ

۱. قرآن پیغمبر اسلام کا دائمی معجزہ ہے، قرآن نے خود بھی بارہا اپنے معجزہ ہونے کو بیان کیا ہے اور چیلنج کیا ہے، قرآن مختلف جہات سے معجزہ ہے لیکن کلی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کے اعجاز کے دو پہلو ہیں، لفظی و معنوی۔

۲. لفظی لحاظ سے قرآن کا اسلوب، مخصوص اسلوب ہے، قرآن کی زیبائی کسی زمانہ، قوم اور ثقافت سے مخصوص نہیں ہے، ابھی تک کوئی بھی اس کے پایہ کا کلام نہیں لا سکا۔

۳. قرآن کے معانی کی بلندی بھی اس کے اعجاز کا دوسرا پہلو ہے قرآن وہ کتاب ہے جو کہ تمام کتابوں سے جدا ہے۔ قرآن خدا کی کتاب ہے جو کہ انسان کو وسیع نظروں سے دیکھتی ہے۔ اور انسان کی ہدایت وسعادت کے پیغام بیان کرتی ہے۔

سوالات

۱. تحدی (چیلنج) کے کیا معنی ہیں اور قرآن کی تحدی کیا ہے؟

۲. قرآن کے اعجازی پہلوؤں کی وضاحت کیجئے۔

۳. قرآن کے لفظی اسلوب کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

۴. معنی کے اعتبار سے قرآن کس نوعیت کی کتاب ہے؟

۵. علوم کے نقطۂ نظر والے انسان اور وحی کے نقطۂ نظر والے انسان میں کیا فرق ہے؟

نواں سبق

پیغمبر اسلامؐ کی سوانح عمری

- عہد طفولیت
- جوانی
- بعثت
- تبلیغ
- ہجرت
- رحلت
- خلاصہ
- سوالات

پیغمبر اسلام کی سوانحعمری

عہد طفولیت

خدا کے آخری پیغمبر حضرت محمدؐ نے ۱۷ ربیع الاول عام الفیل مطابق ۵۷۰ء میں ولادت پائی۔ آپ کی ولادت سے دنیا میں کچھ انقلاب رونما ہوئے۔ دریائے ساوہ، کہ جس کو لوگ سالہا سال سے پوجتے چلے آرہے تھے، ناگہاں خشک ہوگیا، ہزار سال سے روشن آتش کدہ فارس خاموش ہوگیا، کسریٰ کا محل لرز اٹھا اور اس کا ایک حصہ گر گیا، جہاں کہیں کوئی بت تھا وہ زمین بوس ہوگیا اور اس طرح شرک و بت پرستی کے خاتمہ کے آثار نمایاں ہوگئے۔

پیغمبرؐ کے والد عبداللہ اور والدہ آمنہؑ تھیں۔ بچپن میں ہی والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ آپؐ کے جد عبدالمطلب نے آپؐ کی کفالت کی۔ انہوں نے آپؐ کو سعدیہ حلیمہ کے سپرد کردیا تاکہ وہ دیکھ بھال کرے، پانچ سال تک حلیمہ کے پاس رہے اور چھ سال کی عمر میں اپنی والدہ کے ساتھ مدینہ روانہ ہوگئے لیکن مدینہ سے واپسی کے دوران آپؐ کی والدہ بیمار ہوگئیں اور دار فانی سے کوچ کرگئیں۔ آٹھ سال کی عمر میں آپ کے دادا عبدالمطلب کا بھی انتقال ہوگیا۔ ان کی وصیت کے مطابق آپ کے چچا ابوطالبؑ آپؐ کے کفیل ہوئے، عہد طفولیت سے ہی آپ کے چہرہ پر عظمت و بزرگی کے آثار نمایاں تھے،

عبد المطلبؑ وابو طالبؑ دونوں ہی اس بچہ کے چال چلن سے حیرت میں تھے، ان کا ہم سن بچہ ہرگز ایسا نہیں دیکھا گیا تھا کہ جو کھانے وغیرہ سے لگاؤ اور حرص کا اظہار نہ کرتا ہو، آپ معمولی کھانے پر اکتفا کرتے تھے اور پاک وصاف رہتے تھے، زلفوں کو سنوار کے رکھتے تھے، بچوں کے کھیل کود سے رغبت نہیں تھی۔ تنہائی وخلوت کو دوست رکھتے تھے۔ ابو طالب فرماتے ہیں: میں نے کبھی نہ ان کی زبان سے جھوٹ سنا اور نہ کبھی کوئی ناشائستہ بات دیکھی۔

جوانی

پیغمبر اپنے چچا کے گھر پروان چڑھے، پڑھنا، لکھنا نہیں سیکھا تھا لیکن بلوغ کے بعد نظم ونسق اور ادب وامانت میں مشہور ہو گئے اور نظم ونسق اور امانت کے نتیجہ میں قریش کی ایک مشہور دولتمند عورت نے اپنے اموال کا سرپرست بنایا اور اپنا تجارتی کاروبار آپؐ کے سپرد کر دیا، تھوڑے ہی عرصہ بعد اس عورت نے آپؐ سے شادی کی پیشکش کی آنحضرتؐ نے ۲۵ سال کی عمر میں اس پیشکش کو قبول کر لیا اور چالیس سالہ خدیجہ سے شادی کر لی۔

آنحضرتؐ بعثت سے قبل باوجودیکہ بت پرستی کے ماحول میں زندگی گذارتے تھے لیکن کبھی بتوں کے سامنے سر نہیں جھکاتے تھے اور ہمیشہ خدائے وحدہ ویکتا کی عبادت کرتے تھے اور کبھی لوگوں اور شہر کے ہنگاموں سے دور غار حراء میں تشریف لے جاتے تھے اور اپنے پروردگار سے راز ونیاز کرتے تھے۔

بعثت چالیس سال کی عمر میں جب آپ غار حراء میں عبادت میں مشغول تھے

اس وقت پیغمبری کے لئے منتخب ہوئے اور مبعوث بہ رسالت ہوئے، اسی روز گھر لوٹتے وقت راستہ میں اپنے چچا زاد بھائی علی ابن ابی طالب کو دیکھا، آپؐ نے علیؑ کو واقعہ سنایا چنانچہ انہوں نے آپؐ کی بات کی تصدیق کی اور جب گھر تشریف لائے تو آپ کی شریک حیات خدیجہ نے بھی اسلام قبول کرلیا اور ایک مدت تک یہ دونوں پیغمبرؐ کے ساتھ نماز پڑھتے رہے جبکہ دوسرے لوگ کافر تھے۔ ابتدا میں پیغمبرؐ کی ذمہ داری یہ تھی کہ آپؐ مخفی طور پر لوگوں کو ایک خدا کی طرف بلائیں۔

تبلیغ

جب آپؐ نے پہلی بار لوگوں کو دعوت دی تو اس کا شدید ردعمل ظاہر ہوا اور بہت سی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مجبوراً آپؐ نے ایک مدت تک خفیہ طریقہ سے دعوت کا سلسلہ جاری رکھا یہاں تک کہ دوبارہ آپؐ کو حکم ملا کہ آپ اپنے خاندان والوں کو دعوت دیں۔ لیکن اس تبلیغ کا کوئی نتیجہ نہ نکلا صرف حضرت علیؑ نے اپنے ایمان کا اعلان کیا، مدارک کے مطابق شیعوں کا عقیدہ ہے کہ ابو طالب اسلام کے گرویدہ تھے لیکن چونکہ صرف آپؐ ہی پیغمبرؐ کے حامی تھے اسلئے اپنے ایمان کا اظہار نہیں کرتے تھے۔

تین سال کے بعد پھر آپ کو کھلم کھلا تبلیغ کرنے کا حکم ہوا۔ تبلیغ کی ابتدائی زمانہ میں مکہ والوں نے بہت تکلیفیں دیں یہاں تک کہ مسلمانوں کا ایک گروہ عاجز آکر اپنا گھر بار چھوڑ کر حبشہ چلا گیا اور پیغمبر اکرم اپنے چچا ابو طالب اور بنی ہاشم

میں سے اپنے عزیزوں کے ساتھ تین سال تک شعب ابو طالب میں محبوس رہے یہ تین سالہ دور نہایت ہی تنگدستی کا دور تھا کیونکہ سوشل بائیکاٹ تھا باہر نہیں نکل سکتے تھے ۔

بعثت کے دسویں سال اس محاصرہ سے باہر نکلے ۔ پیغمبرؐ کے حامی و مددگار ابوطالب اور آپؐ کی شریک حیات خدیجہ کا انتقال ہوگیا اور پیغمبرؐ جس سال اپنے دو حامیوں سے محروم ہوئے تھے اس کو "عام الحزن" یعنی غموں کا سال کہتے تھے ۔ ابوطالب کے انتقال کے بعد مکہ میں مسلمانوں کے لیے کوئی تحفظ نہیں رہ گیا تھا ۔ لوگوں نے پیغمبرؐ کو اذیت دینے میں انتہا کردی تھی یہاں تک کہ مشرکین مکہ نے خفیہ طور پر رسولؐ کے قتل کا منصوبہ بنالیا ۔ خدا نے رسولؐ کو ان کے منصوبہ سے آگاہ فرمایا اور رسولؐ کو یثرب (مدینہ) کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم دیا ۔

رسولؐ نے علیؑ کو اپنے بستر پر لٹایا اور شب میں خدا کی پناہ میں گھر سے باہر نکلے اور دشمنوں کے درمیان سے گزر گئے اور مکہ سے چند فرسخ کے فاصلہ پر واقع ایک غار میں چھپ گئے ، تین روز کے بعد جب دشمن آپؐ سے ناامید ہو گئے ، غار سے باہر تشریف لائے اور مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے ۔ یہ ہجرت بعثت کے تیرھویں سال ہوئی ۔

ہجرت

پیغمبرؐ نے بعثت کے تیرھویں سال مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی

مدینہ کے ان بزرگوں نے، جو پہلے اسلام لا چکے تھے، آپؐ کا استقبال کیا چنانچہ آپؐ نے پہلی بار مدینہ میں ایک چھوٹا سا اسلامی معاشرہ تشکیل دیا، مدینہ کے اطراف میں بسنے والے یہودیوں اور گرد و نواح میں ساکن قبائل سے معاہدہ کیا اور پھر اسلام کی تبلیغ میں مشغول ہوئے۔ مکہ میں جو مسلمان ظالم قریش کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے۔ وہ بھی رفتہ رفتہ مدینہ آگئے اور مہاجرین کے نام سے مشہور ہوئے، اس طرح یثرب میں ان کے مددگاروں کو بھی انصار کے نام سے یاد کیا جانے لگا

اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ قریش کے بت پرستوں اور حجاز کے یہودیوں نے مسلمانوں کی ترقی کو اپنے کے لئے چیلنج سمجھا، لہذا انہوں نے رخنہ اندازی شروع کر دی اور منافقوں کے ایک گروہ سے کہا کہ کسی بھی طرح مسلمانوں کی ترقی کو روکیں، نتیجہ میں بہت سی جنگیں رونما ہوئیں اور تمام بڑی جنگوں میں پیغمبر بذات خود شریک رہے۔ علیؑ کی شجاعت کی وجہ سے زیادہ تر جنگوں میں مسلمانوں کو فتح ہوئی، مسلمانوں کی دس سال کوشش کے بعد پورا جزیرہ نمائے عرب اسلام کے پرچم کے نیچے آگیا اور بادشاہان ایران، روم مصر، حبشہ کو خط لکھے گئے۔

رحلت

مدینہ میں دس سال گزارنے کے بعد آنحضرتؐ کے بدن میں یہودی عورت کے زہر کھلانے کے سبب نقاہت پیدا ہو گئی اور چند روز کی علالت کے بعد ۶۳ سال کی عمر میں شہادت پائی۔

خلاصہ

(۱) پیغمبر اکرم نے ۱۷ ربیع الاول عام الفیل مطابق ۵۷۰ء کو مکہ میں ولادت پائی۔ آپ کے والد عبداللہ، ولادت سے قبل ہی انتقال فرما چکے تھے اور چھ سال کی عمر میں والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔

(۲) آپ اپنے دادا عبدالمطلب کی وفات کے بعد اپنے چچا ابوطالب کی کفالت میں آئے۔

(۳) پچیس سال کی عمر میں خدیجہ کی پیشکش پر آپ نے شادی کی۔

(۴) چالیس سال کی عمر میں خدا نے رسالت پر مبعوث کیا اور تین سال تک خفیہ طور پر لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے رہے اس کے بعد علی الاعلان اسلام کی دعوت کا آغاز کیا۔

(۵) بعثت کے تیرھویں سال مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی آنحضرت کی ہجرت مسلمانوں کی تاریخ مبدأ بن گئی۔

(۶) ۶۳ سال کی عمر میں مدینہ میں وفات پائی اور اپنے گھر، جو اس وقت مسجد نبوی ہے، میں دفن ہوئے۔

سوالات

(۱) پیغمبرؐ کے بچپن کے حالات قلم بند کیجئے۔

(۲) بعثت سے قبل پیغمبرؐ کی زندگی کی خصوصیات کی وضاحت کیجئے۔

(۳) پیغمبرؐ کی تبلیغ کے مراحل لکھئے۔

(۴) شعب ابی طالب میں مسلمانوں کی کیا حالت تھی؟

(۵) اسلام کی بڑھتی ہوئی ترقی سے کیا اثرات مرتب ہوئے؟

دسواں سبق

پیغمبر اسلامؐ کی اخلاقی و اجتماعی خصوصیات

- بے کاری سے نفرت
- امانت
- عزم بالجزم
- نظم و ضبط
- وفا
- عبادت
- زہد اور سادہ زندگی
- پاکیزگی
- چاپلوسی سے نفرت
- سختی کے ساتھ ساتھ نرمی
- علم کی حوصلہ افزائی
- کمزوریوں سے آگاہ کرنا
- معاشرتی روابط
- خاندان کے ساتھ حسن سلوک
- بچوں کے ساتھ نیک برتاؤ
- غلاموں کے ساتھ برتاؤ
- خلاصہ
- سوالات

پیغمبر اسلامؐ کی اخلاقی واجتماعی خصوصیات

۱۔ بے کاری سے نفرت

بے کاری سے آپؐ کو سخت نفرت تھی۔ فرماتے تھے: "اے اللہ کاہلی و پژمردگی، سستی اور عجز سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں" مسلمانوں کو کام کی تشویق دلاتے تھے اور فرماتے تھے: "عبادت کی ستّر قسمیں ہیں ان میں سے ایک حلال کمائی ہے۔"

۲۔ امانت

آپؐ لوگوں کے درمیان امانتدار مشہور تھے یہاں تک کہ لوگ آپؐ کو محمدؐ کی بجائے امین کہتے تھے اور اپنی امانتیں آپؐ کے پاس رکھتے تھے۔ بعثت کے بعد بھی قریش تمام عداوتوں کے باوجود اپنی امانت رسولؐ ہی کے پاس رکھتے تھے چنانچہ جب رسولؐ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کا قصد کیا تو ان امانتوں کی ادائیگی کے لئے علیؑ کو مکہ میں چھوڑ دیا تاکہ آپؑ امانتداروں تک ان کی امانت پہنچا دیں۔

۳۔ عزم بالجزم

آنحضرتؐ کی رسالت کا پورا ۲۳ سالہ دور استقامت و ثابت قدمی کا درس ہے۔ آپؐ کے لئے بارہا ایسے حالات پیدا ہوئے جن میں ہر طرف سے امیدیں منقطع ہوئیں لیکن آپؐ نے لمحہ بھر کے لئے بھی شکست کا خیال اپنے

ذہن میں پیدا نہ ہونے دیا اور کامیابی کے سلسلہ میں آپ کا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہوا۔

۴۔ نظم وضبط

آپ نے ہر کام کے لئے ایک وقت مخصوص کر رکھا تھا۔ بے کار وقت نہیں گذارتے تھے۔ عبادت کے لئے مخصوص وقت تھا جو کہ یاد خدا و عبادت میں گذرتا تھا۔ اہل عیال اور ان کی ضرورتوں کے لئے ایک وقت خاص تھا اور عام ملاقات کے لئے بھی مخصوص وقت تھا۔

۵۔ وفا

عمار کہتے ہیں: "بعثت سے قبل میں اور آنحضرتؐ ایک ساتھ بکریاں چراتے تھے۔ میں نے ایک روز کہا: فلاں چراگاہ بھیڑ بکریوں کو چرانے کے لئے بہت موزوں ہے۔ کل اپنے ریوڑ کو وہیں لے جائیں گے۔ آنحضرتؐ نے بھی تسلیم کر لیا۔ اگلے روز جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ آنحضرتؐ وہاں موجود ہیں لیکن اپنے گلہ کو چرنے سے باز رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے اس کی وجہ دریافت کی، فرمایا: چونکہ میرا اور تمہارا وعدہ ایک ساتھ شروع کرنے کا تھا اس لئے میں نہیں چاہتا میری بھیڑ بکریاں تمہاری بھیڑ بکریوں سے قبل چراگاہ میں داخل ہوں۔

۶۔ عبادت

رات کے ایک حصہ، کبھی نصف کبھی ایک تہائی اور کبھی دو تہائی کو عبادت میں گزارتے تھے جبکہ پورا دن خصوصاً مدینہ میں محنت و مشقت میں گزرتا تھا لیکن عبادت کے وقت میں کمی نہیں ہوتی تھی، زیادہ تر روزہ رکھتے تھے شعبان کی بیس۲۰ تاریخ سے آخر رمضان تک مسجد میں معتکف رہتے تھے لیکن دوسرے لوگوں سے فرماتے تھے کہ ہر ماہ تین روزے رکھنا اور طاقت کے مطابق عبادت کرنا کافی ہے۔ طاقت سے زیادہ عبادت نہ کرو کہ اس کا الٹا اثر ہوتا ہے۔ رہبانیت اور عزلت گزینی کے مخالف تھے چنانچہ فرماتے تھے: بدن، زوجہ، بچے اور دوست سب کا تم پر حق ہے جس کی تمہیں رعایت کرنا چاہئے۔ خلوت میں نماز کو طول دیتے تھے لیکن جماعت نہایت اختصار کے ساتھ پڑھاتے تھے۔

۷۔ زہد اور سادہ زندگی

آپ کی زندگی زہد اور سادہ زندگی کا ایک اصول تھی۔ سادہ کھانے تناول فرماتے تھے سادہ لباس پہنتے تھے۔ زمین پر بیٹھتے تھے، اپنے ہاتھ سے بکری کا دودھ دوھتے تھے۔ اکثر نان جو و خرما تناول فرماتے تھے۔ اپنی نعلین اور لباس کو خود سیتے تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود فقر کو پسند فرماتے تھے مال و دولت کو معاشرہ کی فلاح اور شرعی امور کے لئے لازمی تصور کرتے تھے

۸۔ پاکیزگی

پاکیزگی اور خوشبو کو دوست رکھتے تھے، خود بھی اس پر عمل کرتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کا حکم دیتے تھے۔ اپنے اصحاب و چاہنے والوں کو تاکید کرتے تھے کہ اپنے بدن اور گھروں کو پاکیزہ اور معطر رکھو۔

۹۔ چاپلوسی سے نفرت

اگر کبھی اصحاب آپؐ پر اعتراض کرتے تھے تو آپؐ ناراض نہیں ہوتے تھے اور انھیں مطمئن فرماتے تھے۔ اپنی تعریف سننے اور مداح سرائی و چاپلوسی سے بیزار تھے، فرماتے تھے: "چاپلوسوں اور فضول تعریف کرنے والوں کے چہروں پر خاک مل دو۔

۱۰۔ سختی کے ساتھ ساتھ نرمی

جو فردی و اجتماعی مسائل آپؐ سے مربوط ہوتے تھے انھیں نظر انداز کر دیتے تھے لیکن عمومی و اصولی اور قانونی مسائل میں سخت رویہ اختیار کرتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد آپؐ نے قریش کی ان تمام گستاخیوں سے چشم پوشی کر لی تھی جو کہ بیس سال تک آپ کی شان میں کی تھیں لیکن فتح مکہ ہی میں بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی اور اس کا جرم ثابت ہو گیا۔ اس عورت کا خاندان مکہ کے شرفاء میں سے تھا، اس کے خاندان والوں نے چوری کی حد جاری ہونے کو

اپنی توہین تصور کیا اور اس کی روک تھام کی کوشش میں مشغول ہو گئے چنانچہ بعض کو سفارش کے لئے تیار کیا تاکہ پیغمبر حد جاری نہ کریں ۔ سفارش سے پیغمبر غضبناک ہوئے اور فرمایا: یہ کیسی سفارش ہے ؟ کیا حکم خدا کو معطل کر دوں ؟

۱۱۔ علم کی حوصلہ افزائی

علم کے سلسلہ میں لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے ۔ اپنے اصحاب کے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دیتے تھے اور فرماتے تھے ۔ علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے ۔ آپ علم حاصل کرنے کے سلسلے میں سن و سال کی قید کے قائل نہیں تھے چنانچہ ارشاد ہے : "گود سے گور تک علم حاصل کرو ۔"

۱۲۔ کمزوریوں سے آگاہ کرنا

آپ لوگوں کی کمزوریوں اور جہالت سے فائدہ نہیں اٹھاتے تھے بلکہ ان کی کمزوری اور جہالت سے انھیں آگاہ فرماتے تھے ۔ جب آپ کے فرزند ابراہیم کا ۱۸ ماہ کی عمر میں انتقال ہوا تو اتفاق سے اسی روز آفتاب کو گہن لگا ۔ لوگوں نے سوچا کہ آفتاب کے گہن لگنے کا سبب پیغمبر کو پہنچنے والا صدمہ ہے ۔ پیغمبر نے لوگوں کے اس جاہلانہ تصور کے مقابل میں خاموشی اختیار نہ کی اور اس ضعیف نکتہ سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا :

"چاند اور سورج خدا کی نشانیوں میں سے دو نشانی ہیں انھیں

کسی کی موت سے گہن نہیں لگتا ہے۔"

۱۳۔ معاشرتی روابط

لوگوں سے خنداں پیشانی کے ساتھ ملتے تھے۔ اپنے اصحاب کی دل جوئی کرتے تھے اگر کسی دن اپنے اصحاب میں سے کسی کو نہیں دیکھتے تھے تو اس کی تلاش میں نکل پڑتے تھے، اگر بیمار ہوتا تھا تو اس کی عیادت کے لئے تشریف لے جاتے۔ اگر مشکلات سے دوچار ہوتا تو اس کی مدد کرتے تھے مجلس میں دائرہ کی صورت میں بیٹھتے تاکہ پائینتی اور سرانہ کا امتیاز نہ رہے، کسی ایک آدمی پر نگاہیں مرکوز نہیں رکھتے تھے بلکہ ہر ایک کو دیکھتے تھے۔ کام میں مشغول افراد کے پاس بے کار بیٹھنے کو برا سمجھتے تھے چنانچہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کام میں شریک ہو جاتے تھے۔

۱۴۔ خاندان کے ساتھ حسن سلوک

اپنی ازواج پر غضبناک نہیں رہتے تھے بلکہ بعض بیویوں کی بدزبانی کو اس حد تک برداشت کرتے کہ اس سے دوسروں کو تکلیف ہوتی تھی، بیویوں کے ساتھ حسن معاشرت کا حکم دیتے تھے اور فرماتے تھے: "سب لوگوں میں نیک و بد خصلتیں موجود ہیں۔ مرد کو صرف اپنی زوجہ کے ناپسندیدہ فعل کی گرفت کرکے اس سے جدا نہیں ہونا چاہئے کیونکہ جب اس کی ایک خصلت سے ناراض ہوتا ہے تو اس کی دوسری عادت خوشنودی کا باعث ہوتی، لہذا

ان دونوں کو مدنظر رکھنا چاہیے

۱۵۔ بچوں کے ساتھ نیک برتاؤ

بچوں کو سلام کرتے تھے اور اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد سے بہت زیادہ محبت فرماتے تھے۔ مسلمانوں کے بچوں سے بھی محبت کرتے تھے انھیں زانو پر بٹھاتے اور سر پر دست شفقت پھیرتے تھے۔ مائیں اپنے چھوٹے بچوں کو آپؐ کی خدمت میں لاتی تھیں اور ان کے حق میں آپ سے دعا کرنے کی درخواست کرتی تھی ایک مرتبہ ایک بچے نے آپؐ کا لباس تر کر دیا تو بچہ کی ماں بہت شرمندہ ہوئی اور بچہ کو دھمکی دینے لگی آپ نے اسے ایسا کرنے سے منع کیا۔

۱۶۔ غلاموں کے ساتھ

غلاموں پر بہت زیادہ مہربان تھے اور لوگوں سے فرماتے تھے۔ یہ تمہارے بھائی ہیں، جو تم کھاؤ وہی انھیں کھلاؤ جو تم پہنو وہی انھیں پہناؤ ان کے ذمہ سخت کام نہ کرو۔ ان کے کاموں میں تم خود بھی مدد کیا کرو، اور انھیں غلام وکنیز کے نام سے نہ پکارا کرو۔ بردہ فروشی کو بدترین شغل جانتے تھے اور فرماتے تھے۔ خدا کے نزدیک بدترین انسان آدم فروش ہے۔

ماخذ و مدارک

۱۔ شیعہ در اسلام — مرحوم علامہ طباطبائی
۲۔ شناخت اسلام — شہید بہشتی
۳۔ وحی نبوت — شہید مطہری
۴۔ انسان وایمان — شہید مطہری
۵۔ ختم نبوت — شہید مطہری

خلاصہ

رسولؐ کی بعض اخلاقی خصوصیات :

١) بے کاری سے نفرت تھی اور لوگوں کو کام کی تشویق دلاتے تھے۔

٢) امانت داری میں شہرت یافتہ تھے، چنانچہ لوگ آپ کو محمدؐ امین کہتے تھے۔

٣) کبھی بھی آپکے ذہن میں شکست کا خیال پیدا نہیں ہوا اور ہمیشہ ثابت قدم رہے۔

٤) اپنے اوقات کو منظم طریقے سے عبادت، خاندان اور لوگوں کیلئے تقسیم کر رکھا تھا۔

٥) راتوں کو اکثر عبادت میں مشغول رہتے تھے اور دو تہائی یا ایک تہائی رات میں بیدار رہتے تھے۔

٦) بہت سادہ زندگی گذارتے تھے، پاکیزہ رہتے تھے، لوگوں سے خندہ پیشانی اور مودبانہ انداز میں ملتے تھے، بچوں پر مہربان اور اپنے خاندان کے لئے خوش اخلاق تھے۔

سوالات

١) پیغمبر کے عزم بالجزم کی کیا نوعیت تھی؟

٢) پیغمبر کی زندگی کا نظم و ضبط بیان کیجئے۔

٣) پیغمبر کی زندگی میں عبادت کی کیا اہمیت تھی؟

٤) پیغمبر کی ایک اخلاقی خصوصیت کی وضاحت کیجئے۔

٥) کیا پیغمبر لوگوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے تھے؟

٦) پیغمبر کی ایک اجتماعی خصوصیت کی وضاحت کیجئے۔

۴
امامت کی بحث
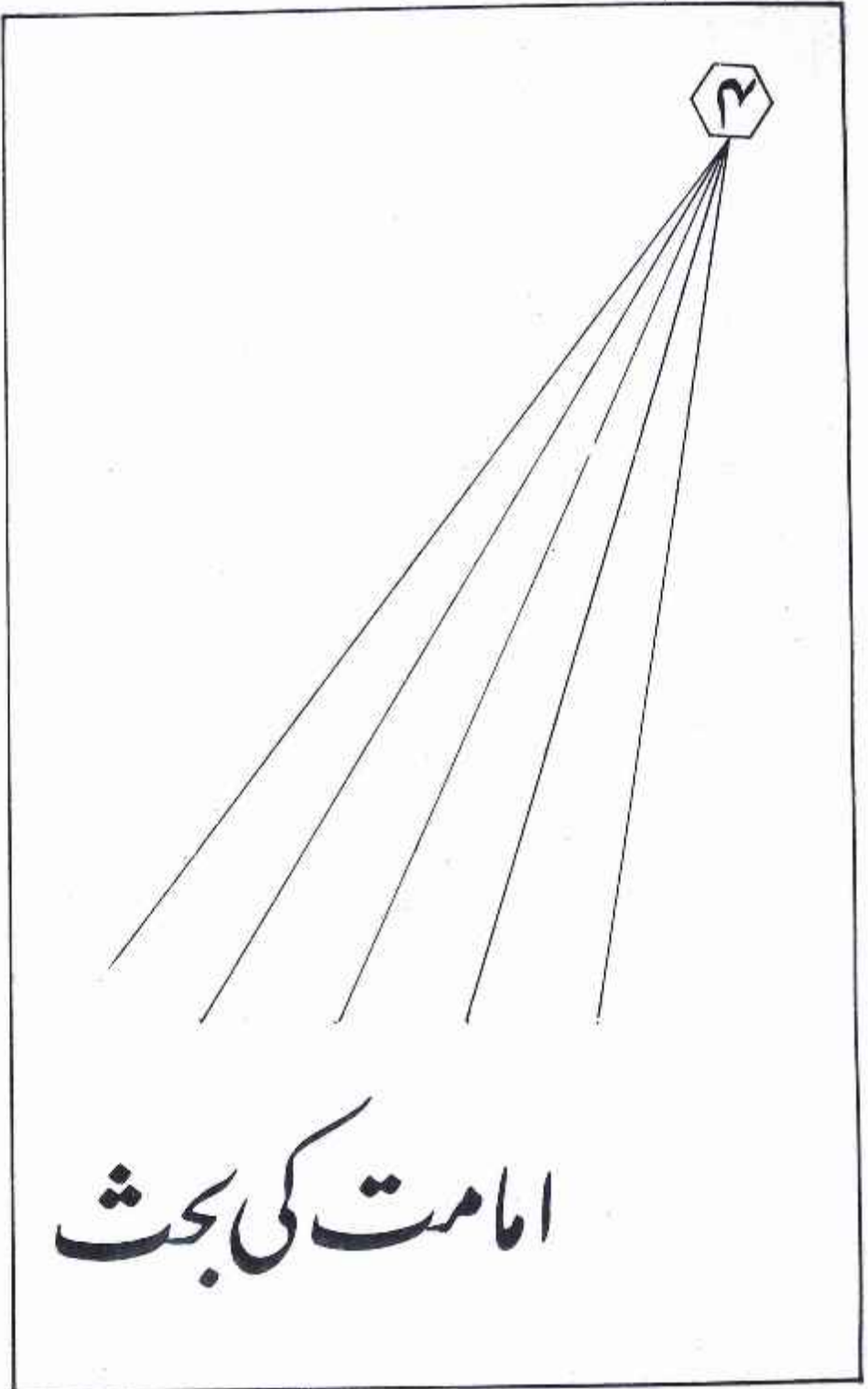
پہلا سبق

امامت اور حقیقت پسندانہ موقف

- بحث امامت کی ضرورت
- کونسا موقف برحق ہے
- خلاصہ
- سوالات

امامت اور حقیقت پسندانہ موقف

بحث امامت کی ضرورت

پیغمبرؐ کے بعد مسلمانوں کا رہبر کون ہے؟ ممکن ہے یہ تصور کیا جائے کہ امامت و خلافت ایک تاریخی بحث ہے۔ تاریخی پہلو کے علاوہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لہذا مسلمانوں کے اتحاد اور تفرقہ سے بچتے ہوئے اس قسم کے مباحث سے چشم پوشی اختیار کرنا چاہیئے اور اپنی توجہ کو اسلامی معاشرہ کے اہم ترین مسائل کی طرف مبذول کرنا چاہیئے۔

لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیئے کہ مسئلہ امامت مختلف پہلوؤں کا حامل ہے اور ان میں سے ہر ایک کو اسلامی معاشرہ کے لئے ہمیشہ حیات بخش کہا جاتا ہے

۱۔ امامت سے متعلق بحث، اسلامی حکومت کی ماہیت، فرمانروائی کے طریقہ اور مسلمانوں کے امور کی کارکردگی کے سلسلہ میں، بحث ہے جو کہ رحلت پیغمبرؐ کے وقت سے آج تک چلی آرہی ہے، واضح ہے کہ ایسی بحث نہ فقط مفید ہے بلکہ اس کا تعلق کامل طور پر ہماری سرنوشت سے ہے۔

۲۔ پیغمبرؐ کے انتقال کے بعد کس سے احکام لیئے جائیں اور فکری و عقیدتی مشکلات میں لوگوں کا ملجا و پناہ گاہ کون ہے اور اس سلسلہ میں وہ کس سے رجوع کریں، کیا امت اصول و فروع میں سے ہر ایک چیز کو اصحاب پیغمبرؐ سے حاصل کرسکتی ہے یا پیغمبرؐ نے خود امت کے لئے کسی معصوم و مطمئن ذات کو معین کیا ہے؟

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ پیغمبرؐ نے معصوم ائمہ کو معین کیا ہے اور انھیں مرجع و پناہ گاہ کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔

کونسا موقف برحق ہے؟

بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے خصوصاً اہل تشیع و اہل تسنّن کے درمیان کوئی ارتباط نہیں ہونا چاہیئے، یہ لوگ تعصب کی وجہ سے اسلام کے صحیح خدوخال کو نہیں پہچان سکے، وہ مسلمانوں کے نغمۂ وحدت کو ایک افسانہ سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کے اختلاف و پراگندگی سے متاثر نہیں ہوتے ہیں۔

دوسرا گروہ اس جاہلانہ تعصب کی وجہ سے آپے سے باہر ہوگیا: اس کا خیال ہے کہ مسئلہ امامت و خلافت سے بحث کرنا گویا تفرقہ و دشمنی کو دعوت دینا ہے اس لئے اس سلسلہ میں ہر ایک بحث کو حرام قرار دیا اور ان مسائل سے متعلق بحث کو یہاں تک آزاد علمی ماحول میں بھی، مذموم بحث سمجھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خواہ جاہلانہ تعصب کی رو سے دیکھیں خواہ روشن فکر نظروں سے دیکھیں دوسرے گروہ کا طریقہ غلط اور غیر منطقی ہے۔

جو گروہ اختلافی مسائل سے بحث کو حرام قرار دیتا ہے اور اسے مسلمانوں کی وحدت کے منافی سمجھتا ہے اسے معلوم ہونا چاہئے کہ ایسے نظریہ کے اتباع سے قرآن مجید کی بعض آیات اور پیغمبرؐ کی بعض احادیث اور تاریخ اسلام کے

ایک بہت بڑے حصہ سے آنکھیں بند کرنا اور ان کی تحقیق و تفسیر میں نہ پڑنا اور بہت سے اہم حوادث کی تحقیق ممنوع قرار پاتی ہے۔

خطرہ اس وقت اور یقینی ہو جاتا ہے جب ایک گروہ نادانی کی بنا پر مسئلہ وحدت سے غلط نتیجہ اخذ کرتا ہے اور ان مسائل کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ جس کا نتیجہ عقیدتی مسائل میں انحراف اور تاریخی موضوعات میں تحریف ہوتی ہے۔

صحیح راستہ یہ ہے کہ تمام تعصبات سے ہٹ کر ہم حقیقت شناسی کیلئے قدم اٹھائیں تو یقین کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر بحث و گفتگو تعصب سے پاک ہو اور اس کا سرچشمہ وہ اسلامی مدارک ہوں جن پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے تو یہ بحث نہ فقط اختلاف کا باعث نہیں بنے گی بلکہ مضبوط وحدت کا سبب بنے گی۔ کیونکہ حقیقی وحدت قدر مشترک اور اختلافی موارد کو پہچاننے میں عملی ہو جائے گی۔

جب بھی ہر گروہ کے دانشور، بغیر کسی تعصب اور عوام فریبی کے اختلافی مسائل کی تشریح کریں گے تو بہت سی تہمتیں، جھوٹ، بدگمانیاں جو کہ خاص طور سے عوام کے درمیان پائی جاتی ہیں وہ ختم ہو جائیں گی اور حقیقت واضح ہو جائے گی۔

شیعوں اور سنیوں کے درمیان ایسی دسیوں چیزیں مشترک ہیں جن کے سبب وہ ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں۔ ہر چند دونوں کے درمیان بعض عقیدتی مسائل میں اختلاف ہے لیکن ان کا زیادہ تر اختلاف ایسا ہی ہے جیسا کہ خود اہل سنت کے فرقوں، جیسے اشعری، معتزلی، حنفی و

شافعی کے درمیان ہے اور جس طرح اہل سنّت کے دو فرقوں کے درمیان بعض مسائل میں اختلاف و نزاع و فساد کا موجب نہیں ہوتا ہے اور دونوں مذہب کے ماننے والے بھائی بھائی کی مانند ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں، ایک یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں اسی طرح شیعہ و اہل سنت کے درمیان کے اختلاف کو بھی نزاع و تفرقہ کا باعث نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ باکمال صدق و صفا ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ زندگی گذارنا چاہیئے۔ تعصب سے خالی علمی بحث ــــ جو کہ حقیقت شناسی کے لئے ہے ــــ میں کوئی حرج نہیں ہے۔

خلاصہ

(۱) امامت میں مختلف پہلو ہیں اور ان میں سے ہر ایک اسلامی معاشرہ کے مسائل کے لئے حیات بخش شمار ہو سکتا ہے، صرف یہ مسئلہ باقی رہتا ہے کہ اس سلسلہ میں صحیح موقف اختیار کرنا چاہئے۔

(۲) صحیح موقف یہ ہے کہ شیعہ و اہل سنت ہر قسم کے تعصب سے الگ ہو کر بحث و گفتگو کریں اور مشترک و اختلافی مسائل کی تحقیق کریں، اور شیعہ و سنی کے اختلاف کو ہرگز اہل سنت کے دو فرقوں کے اختلاف سے زیادہ اہمیت نہ دیں۔

سوالات

(۱) مسئلہ امامت سے متعلق بحث کی ضرورت کی تشریح کیجئے۔

(۲) مسئلہ امامت کا سنی شیعہ کے مسئلہ سے کیا ربط ہے؟ تحریر کیجئے

(۳) شیعہ سنی وحدت کے سلسلہ میں کتنے موقف ہیں؟

دوسرا سبق

امامت، فریقین کی نظر میں

- اہل سنت کا نظریہ
- شیعوں کا نظریہ
- خلاصہ
- سوالات

امامت فریقین کی نظر میں

اہل سنت کا نظریہ

علماء اہل سنت کے نقطۂ نظر سے امامت ایک اجتماعی منصب ہے جو کہ دنیا کی تمام اقوام وملل کے درمیان موجود ہے جیسا کہ رئیس جمہور اور وزیر اعظم کا منصب اجتماعی ہے ہر جگہ کسی نہ کسی طریقہ سے چنا جاتا ہے۔ امام بھی رسول اسلام کی وفات کے بعد ایسے ہی ہے جس کو کچھ لوگ یا وہ شخص منتخب کرتا ہے جس کے ہاتھ میں لوگوں کے امور کی باگ ڈور ہوتی ہے

امام کی خصوصیات کے متعلق باقلانی کہتے ہیں:

"اگر کوئی شخص پوچھے: ہمیں اس امام کے صفات بتائیے جس کی لوگ بیعت کرتے ہیں؟ تو ہم کہیں گے کہ امام کو حسب ذیل خصوصیات کا حامل ہونا چاہئے: قریشی ہو، اس کے اندر اتنی علمی صلاحیت ہو کہ مسلمانوں کا قاضی بن سکے، جنگی امور میں فوجی سوجھ بوجھ رکھتا ہو، ملک کی سرحدوں کا تحفظ کر سکتا ہو، اسلام و امت کے بنیادی اصولوں کی نگہبانی کر سکتا ہو، ستمگروں سے انتقام لے سکتا ہو اور ستم دیدہ لوگوں کا دفاع کر سکتا ہو، اجتماعی مصالح میں بصیرت رکھتا ہو۔"[1]

([1] التمہید ص۱۸۱)

بہت سے لوگوں کا نظریہ ہے کہ گناہوں کے ارتکاب ستمگری، لوگوں کے اموال کو غصب کرنے، بے گناہوں کو مارنے اور قتل کرنے حقوق پامال کرنے اور حدود کو معطل کرنے سے امام کو منصب امامت سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور اس کے خلاف شورش واجب نہیں ہوتی بلکہ واجب یہ ہے کہ اسے وعظ و نصیحت کریں اور ڈرائیں۔...''[1]

شافعیوں کے امام قاضی ایجی:

''بہت سے لوگوں کا نظریہ ہے کہ ائمہ کو اصول و فروع میں مجتہد ہونا چاہیئے تاکہ دینی امور کو انجام دے سکیں، صاحب نظر ہونا چاہیئے تاکہ ملکی امور کو انجام دے سکیں، شجاع ہونا چاہیئے تاکہ مکتب اسلام کا دفاع کر سکیں۔ لیکن ایک گروہ ان صفات کو لازم نہیں سمجھتا، کیونکہ ایسے افراد نہیں پائے جاتے۔ اسی وجہ سے یہ شرائط بے ہودہ اور بے جا ہیں اور ان سے مفسدہ لازم آتا ہے جو کہ اس شخص کو نصب کرکے کہ جس میں شرائط نہ پائے جاتے ہوں دور ہو جاتا ہے۔

جی ہاں! امام کا عادل ہونا شرط ہے تاکہ ستمگار نہ بن جائے عاقل ہونا ضروری ہے تاکہ تصرفات کر سکے ...''[2]

---

[1] التمہید ص ۱۸۱

[2] المواقف

''اگر کسی امام کا انتقال ہو جائے تو وہ شخص جو جامع الشرائط ہے امر امامت کو اپنے ہاتھوں میں لے سکتا ہے چاہے اس کی بیعت نہ ہو اور جانشین کے طور پر معین نہ ہوا ہو خلافت اس کا حق ہے اسی طرح جاہل و فاسق بھی امام ہو سکتا ہے[1]''

قاضی ایجی تعیین امام کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

" امامت پیغمبر کی نص اور اجماع کے طور پر پہلے امام کی تعیین نیز اہل حل و عقد کی بیعت سے ثابت ہوتی ہے ابوبکر کی امامت کے سلسلے میں ہماری دلیل بیعت ہی ہے۔ "

شیعوں کا نظریہ

شیعوں کے نقطہ نظر سے منصب امامت کی کچھ اور ہی حیثیت ہے اور اہل سنت کے نظریہ سے بنیادی طور متفاوت ہے۔ مکتب تشیع میں امامت منصب الٰہی ہے اور خدا کو چاہیئے کہ وہ امام معین کرے بالکل ایسے ہی جیسے نبوت منصب الٰہی ہے اور خدا پیغمبر کو منتخب کرتا ہے۔ کوئی شخص لوگوں کے انتخاب سے ہرگز نبی نہیں بن سکتا، اسی طرح امام بھی۔ کیونکہ امام و خلیفہ جو کہ نبی کے جانشین کے معنی میں ہے، جیسے پیغمبر خدا کی طرف سے معین ہوتا ہے اس کے خلیفہ و جانشین کو بھی خدا ہی کی طرف سے منتخب ہونا چاہیئے۔

---

[1] شرح المقاصد جلد ۲ ص ۲۷۲

پیغمبر کے مقابلہ میں لوگوں کی دو قسمیں ہیں : مومن و کافر ۔ یہاں انتخاب ، چناؤ ، شوریٰ یا زیادہ ووٹ بے معنی اور شناخت و عدم شناخت ایمان و انکار ، تصدیق و تکذیب محل بحث ہے اگر دنیا کے سارے انسان ایک الیکشن میں پورے طریقہ سے آزاد "مسیلمہ کذاب" کو باتفاق نبوت و پیغمبری کے لئے چن لیں اور پیغمبر اسلام کو ایک ووٹ بھی نہ دیں تو بھی مسیلمہ پیغمبر نہیں بن سکتا اور پیغمبر اسلام بھی اپنی نبوت سے دست بردار نہیں ہوسکتے ۔

بالکل یہی مفہوم امام کے لئے بھی حکم فرما ہے جیسا کہ نبوت ایک حقیقت ہے ایسے ہی امامت بھی ایک حقیقت ہے ہمیں اس جہت سے پیغمبر و امام کو پہچاننا چاہئے ۔

رسول اسلام کے بعد لوگوں کی امامت و قیادت ہی رسالت کے فرائض کو انجام دینے کی ذمہ دار ہے ۔ امام و نبی میں صرف یہ فرق ہے کہ پیغمبر دین کا لانے والا ، وحی الٰہی کا حامل اور صاحب کتاب ہے امام ان دو چیزوں کے علاوہ پیغمبر کی تمام ذمہ داریوں کا حامل ہے : امام اصول و فروع دین کا بانی اور تحریف سے بچانے کا ذمہ دار ہے ، تمام دینی و دنیوی امور کا مرجع اور نبوت کے فرائض کو جانشین کی حیثیت سے انجام دینے والا ہے ۔

ان عظیم ذمہ داریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مہم کو انجام دینے کے لئے امام کو دو خصوصیتوں کا حامل ہونا چاہئے :

۱ ۔ قطع نظر اس سے کہ امام کو افراد سے علم حاصل نہیں کرنا چاہئے ، اصول و فروع ، معارف الٰہی اور دیگر چیزوں میں اسے اعلم ہونا چاہئے تاکہ اسلام کے

اصول و فروع کو بیان کر سکے اور امت کی علمی و معنوی تمام ضرورتوں کو پورا کر سکے کیوں کہ ایسے وسیع علم کے بغیر اسلامی معاشرہ کی مشکلات اور خدائی ذمہ داریوں کو انجام دینا ممکن نہیں ہے۔

۲- امام کو گناہ و خطا سے پاک ہونا چاہئے کیونکہ پیغمبر کے بیان کردہ ضوابط کی بنیاد پر عصمت کے بغیر لوگوں کا مورد اعتماد قرار نہیں پائے گا اور نہ ہی لوگوں کے لئے نمونہ بن سکے گا۔

ان خصوصیات کا تعلق قلبی امور سے ہے اور لوگ ان سے بے خبر ہیں ظاہر و باطن کا عالم خدا ہے اسی کو چاہئے کہ امام کو منتخب کرے اور لوگوں کو بتائے کیوں کہ لوگ ایک دوسرے کے قلبی امور سے واقف نہیں ہوتے ہیں اور اکثر ان کے انتخاب میں غلطی ہوتی ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق خدا کے عظیم پیغمبر حضرت موسیٰؑ نے ہزاروں آدمیوں کے درمیان سے بہترین ستر آدمی چنے اور میقات الٰہی میں لے گئے۔

جیسے ہی میقات الٰہی میں پہنچے سب کہنے لگے ہم کو آشکارا طور پر خدا کو دکھائیے [۱]

جب خدا کے عظیم پیغمبر کا انتخاب ایسا ہے تو عام لوگوں کے انتخاب کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اسی لئے تو خداوند عالم فرماتا ہے:

"وربک یخلق مایشاء ویختار ما کان لھم الخیرۃ فی الامر۔"

اور تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور

[۱] نساء/۱۵۳

منتخب کرتا ہے اور یہ انتخاب لوگوں کے اختیار میں نہیں ہے۔"[1]

پیغمبر اسلام نے اپنی ابتدائے رسالت میں جب عرب کے قبائل کے سامنے اسلام پیش کیا اور ایک قبیلہ کو آئین الٰہی کی طرف بلایا تو ان کے نمائندہ نے کہا اگر ہم تمہارے دین کی پیروی کریں اور تمہارا پروردگار تمہارے مخالفوں پر کامیابی عطا کرے تو کیا تمہارے بعد دین اور لوگوں کی سرپرستی ہمارے ہاتھوں میں آئے گی؟

آنحضرت نے فرمایا اس کا اختیار خدا کو ہے وہ جہاں چاہے گا اسے قرار دے گا۔[2]

---

[1] قصص / ۶۸

[2] سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۳۲، الروض الانف جلد ۱ ص ۲۹۳، سیرت حلبیہ جلد ۲ ص ۳، بہجۃ المحافل ج ۱/ ۱۲۸ سیرت ابن دخلان ج ۱ ص ۳۰۲ ہامش حلبیہ

خلاصہ

۱. علماء اہل سنت امامت کو اجتماعی منصب سمجھتے ہیں جیسا کہ دنیا کی تمام اقوام وملل میں رائج ہے کہ عوام یا اہل حل وعقد اس کو منتخب کرتے ہیں۔

۲. شیعوں کے نقطہ نظر سے امامت الٰہی منصب ہے اور خدا ہی کو امام معین کرنا چاہئے۔ امامت رسالت کا جزء ہے اور امام پیغمبر کا جانشین ہونے کی حیثیت سے ان کی تمام ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے۔ اسی لئے امام کو معصوم اور وسیع علم کا حامل ہونا چاہئے۔

۳. ان خصوصیات کا تعلق قلبی امور سے ہے اور خدا ظاہر و باطن کا عالم ہے اور کسی کو ان کی خبر نہیں ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ امام کو خدا ہی معین کرے۔

سوالات

۱. امامت کے سلسلہ میں اہل سنّت کا نظریہ لکھئے۔

۲. امام کے صفات کے متعلق اہل سنّت کے علماء کا کیا نظریہ ہے؟

۳. امامت کے متعلق شیعوں کا نظریہ لکھئے۔

۴. شیعہ، امام کے لئے کن صفات کو ضروری سمجھتے ہیں؟

تیسرا سبق

امامت کے متعلق قرآن کا نظریہ

- آیۂ امامت
- ظلم کا مفہوم قرآن کی نظر میں
- خلاصہ
- سوالات

امامت کے متعلق قرآن کا نظریہ

دونوں مذاہب کی اجمالی خصوصیت کی شناخت کے بعد ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ جس پر دونوں مذاہب کا اتفاق ہے، تا کہ امامت کے متعلق قرآن کے نظریہ سے آشنا ہو جائیں۔

قرآن نے خدا کی طرف سے معین امام کے لئے چند خصوصیات بیان کی ہیں جو کہ اس کی رہبری کو دوسروں کی رہبری سے ممتاز کرتی ہیں وہ خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ امام کو معصوم ہونا چاہئے ۲۔ امام کو خدا کی طرف سے معین ہونا چاہئے

حضرت ابراہیمؑ کی امامت

و اذ ابتلی ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن قال: انی جاعلک للناس اماما، قال ومن ذریتی، قال لا ینال عھدی الظالمین. (بقرہ / ۱۲۴)

اس وقت کو یاد کیجئے جب خدا نے ابراہیم کو چند کلمات کے ذریعہ آزمایا اور ابراہیم کامیاب ہوگئے تو خدا نے فرمایا: میں نے تمہیں لوگوں کا امام قرار دیا۔ ابراہیم نے عرض کی میری اولاد میں سے بھی کسی کو یہ منصب ملے گا؟ ارشاد ہوا

میرا عہدہ (امامت) ظالموں کو نہیں ملے گا۔

ان آیات سے ہم چند نتیجے نکالتے ہیں :

۱۔ منصب امامت پر پہنچنے کے لئے، استعداد، شائستگی اور مخصوص لیاقت درکار ہے۔ ہر ایک اس منصب پر فائز نہیں ہوسکتا کیونکہ جب حضرت ابراہیمؑ نے دل کی آنکھوں سے آسمانوں و زمین کی چیزوں کا مشاہدہ کیا اور انھیں یقین حاصل ہوگیا نیز امتحان اور آتش نمرود اور اپنے فرزند اسماعیل کی قربانی اور دیگر خدائی امتحانات میں کامیاب ہوگئے تو خدا کی طرف سے منصب امامت پر فائز ہوئے۔

۲۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کی امامت نبوت کے علاوہ تھی اور نبوت سے بلند تھی کیونکہ حضرت ابراہیم باوجودیکہ نبی تھے سخت امتحان میں مبتلا ہوئے اور جب شائستگی سے اس امتحان میں کامیاب ہوگئے تو منصب امامت پر فائز ہوئے۔

۳۔ اس آیت میں خصوصاً امام کی عصمت کی طرف اشارہ ہوا ہے، جب حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹوں کے لئے امامت کا سوال کیا تو خدا نے فرمایا میرا عہدہ (امامت) ظالموں کو نہیں ملے گا۔ "لاینال عہدی الظالمین"

اس بنا پر اگر اپنی زندگی کے کسی بھی لمحے میں ظلم کا مرتکب ہوا ہوگا تو وہ میثاق خدا اور منصب امامت کے لائق نہیں رہے گا۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآن میں ظلم کن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

۳/۱۔ خدا کا شریک ٹھہرانا اور کفر اختیار کرنا بہت بڑا ظلم ہے، کائنات کو

پیدا کرنے والا عالم و قادر ہے، تمام تعریفیں اور عبادتیں، دعائیں خدا ہی کے لئے ہیں۔ اگر کسی نے خدا کے علاوہ کسی اور کی عبادت و ستائش کی اور اس کے علاوہ کسی دوسرے سے حاجت طلب کی تو اس نے خدا کے حق کو پامال کیا اور وہ ظالم ہے۔

ان الشرک لظلمٌ عظیم (لقمان/ ۱۳)

"بے شک شرک عظیم ظلم ہے"

۲/۳ اجتماعی فلاح و بہبود اور معاشرہ میں عدالت کا قیام، اس صورت میں ممکن ہے کہ جب تمام انسان ایک دوسرے کے حقوق کا احترام کریں۔ اس بنا پر اگر کوئی قانون شکنی کا مرتکب اور عدالت سے فرار کرے اور دوسروں کے حقوق پامال کرے تو اسے ظالم و ستمگار کہا جائے گا۔

انما السبیل علی الذین یظلمون النّاس و یبغون فی الارض بغیر الحق اولئک لهم عذاب الیم

(شوریٰ/ ۴۲)

"الزام تو فقط ان ہی لوگوں پر ہوگا جو لوگوں پر ظلم کرتے اور روئے زمین پر زیادتیاں کرتے پھرتے ہیں۔ ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔"

۳/۳ ۔ خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے تاکہ کمال اور سعادت کی بلندی پر پہنچ جائے اس منزل پر فائز ہونے کے لئے خدا نے کچھ قوانین اور نقشے اس کے اختیار میں دیدیئے ہیں اس بنا پر جس شخص نے خدا کے دستورات و قوانین سے

منہ موڑا اس نے خود کو سعادت سے محروم کر لیا اور اپنے نفس پر ظلم کیا ہے۔

فمنهم ظالم لنفسه ومنهم مقتصد ومنهم سابق

بالخیرات : (فاطر/ ۳۲)

"لوگوں میں سے بعض تو اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں کچھ میانہ رو ہیں اور کچھ ان میں سے نیکی کی طرف سبقت کرتے ہیں۔"

جن چیزوں کو قرآن نے ظلم قرار دیا ہے ان کے پیش نظر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ: بعض لوگ ایسے ہیں جو عمر بھر معصیت و گناہ کرتے رہتے ہیں اور ہمیشہ ظالم رہتے ہیں۔ بعض افراد ابتدائے عمر میں گناہ کرتے ہیں لیکن توبہ کر کے راہ راست پر آجاتے ہیں، لیعض افراد ابتدائے عمر میں تو گناہ نہیں کرتے۔ مگر آخری عمر میں گناہوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں لیکن بعض افراد ہمیشہ راہ عدالت پر گامزن رہتے ہیں ان کے پاک وجود پر کبھی بھی گناہ کی گرد نہیں بیٹھتی ہے۔

قرآن کی نظر میں صرف یہی گروہ امامت کے بلند مقام کا مستحق ہے دوسرے ظالم شمار کئے جاتے ہیں اور خدا ستمگاروں سے میثاق نہیں باندھتا۔

لا ینال عہدی الظالمین

میرا عہدہ ظالموں کو نہیں ملے گا۔

۴۔ دوسری خصوصیت قرآن نے امام کے لئے یہ بیان ہے کہ اتباع کرنے والا کا امام خدا کی طرف سے معین ہونا چاہیے خدا امامت کو اپنا میثاق۔ عہدی۔ کہتا ہے اور خدا صرف اس سے پیمان باندھتا ہے جو پاکیزگی کے لئے کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا ہے۔ جب ابراھیم خدا کے تمام امتحانات میں کامیاب

ہوگئے اور ان کی شائستگی و خصوصیت ثابت ہوگئی تو خدا نے فرمایا:

انی جاعلك للناس اماما

"میں نے تمہیں لوگوں کا امام بنا دیا"

عصمت اور گناہوں سے پاک رہنا ہے قلبی اور باطنی امر ہے لوگ اس سے واقف نہیں ہو سکتے اور امامت کے لئے اس شخص کو منتخب نہیں کر سکتے جو گناہوں سے پاک ہو، خدائے متعال ظاہر و باطن سے واقف ہے وہ امام کو منتخب کرتا ہے اور لوگوں کا امام معین کرتا ہے۔ قرآن کے نقطہ نظر سے امام کا انتخاب لوگوں کے اختیار میں نہیں دیا گیا ہے یہ خدا کا امر ہے وہی اسے ایجاد کرتا ہے۔

خلاصہ

① قرآن نے امام کے لئے ایسی خصوصیات ذکر کی ہیں جو اسے دوسرے رہبروں سے ممتاز کرتی ہیں ۔ یہ خصوصیات عبارت ہیں عصمت اور خدا کے منتخب کرنے سے ۔

② آیت "لا ینال عهدی الظالمین" سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کو معصوم ہونا چاہئے اور کسی گناہ سے اس کا وجود آلودہ نہیں ہونا چاہئے ۔

③ عصمت ایک قلبی اور باطنی چیز ہے لوگ اس سے آگاہ نہیں ہو سکتے اور گناہ سے محفوظ شخص کو امامت کے لئے منتخب نہیں کر سکتے ۔ خدا ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے لہٰذا خود امام کو معین کرتا ہے " انی جاعلک للناس اماماً "

سوالات

① قرآن نے امام کے لئے کیا خصوصیات بیان کی ہیں ؟

② عصمت امام کے سلسلہ میں قرآن کا نظریہ بتائیے ۔

③ قرآن میں ظلم کا کیا مفہوم ہے ؟

④ امام کے انتخاب کا اختیار لوگوں کو کیوں نہیں دیا گیا ؟

⑤ خدا نے منصب امامت کو کس چیز سے تعبیر کیا ہے اور اس کی ایجاد کس طرف سے ہے ؟

چوتھا سبق

خدا معصومین پاک کا تعارف کراتا ہے

- آیت تطہیر
- پیغمبرؐ مستقل اہل بیتؑ کا تعارف کراتے تھے
- اہل بیتؑ قرآن کے ہم پلہ ہیں
- حدیث ثقلین
- خلاصہ
- سوالات

خدا معصومینؑ پاک کا تعارف کراتا ہے

ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید کے نقطہ نظر سے اس شخص کو منصب امامت مل سکتا ہے جو تمام گناہوں سے پاک ہو اور خداوند عالم امامت کے لئے معصوم کو معین کرتا ہے۔ قرآن نے معصوم ائمہ کا تعارف اس طرح کرایا ہے :

آیت تطہیر

انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرّجس اھل البیت ویطھّرکم تطھیرا ۔

(احزاب / ۳۳)

خدا کا بس یہ ارادہ ہے کہ آپ اہل بیتؑ کو ہر گناہ و رجس سے اس طرح پاک رکھے جیسا کہ حق ہے۔

آیت تطہیر ام المومنین ام سلمہؓ کے گھر میں نازل ہوئی ہے۔ آیت کے نزول کے وقت حضرت علیؑ، جناب فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ آنحضرت کے پاس تھے۔ ام سلمہ کہتی ہیں :

"میں دروازے پر کھڑی تھی۔ آیت تطہیر کے نزول کے بعد میں نے رسولِ خدا سے پوچھا : کیا میں اہل بیت میں نہیں ہوں ؟ آپ نے

فرمایا:
تم وہ عورت ہو جس کی عاقبت بخیر ہے۔ تم رسولؐ کی بیوی ہو۔[1]
اصحاب میں نمایاں اشخاص کے ایک گروہ، یعنی عبداللہ ابن عباس، رسولؐ کے منھ بولے بیٹے عمر ابن ابی سلمہ، ابو سعید خدری، سعد بن ابی وقاص اور انس ابن مالک وغیرہ نے آیت تطہیر کا نزول اسی طرح بیان کیا ہے۔[2]
اس گروہ نے جو روایات اس سلسلہ میں رسولؐ سے نقل کی ہیں ان سب کا ایک ہی مفہوم ہے اور وہ یہ کہ آیت تطہیر ام سلمہ کے گھر میں پنجتن کی شان میں نازل ہوئی ہے اور نبی کی کوئی بیوی اس آیت کی مصداق نہیں ہے۔

پیغمبر مستقل اہل بیت کا تعارف کراتے ہیں

آیت تطہیر کے نزول کے بعد، رسول خداؐ نے مسلمانوں کو اہل بیتؑ کی عظمت و منزلت بتانے کی غرض سے، اہل بیتؑ کی معرفت کرانے کے سلسلہ میں بہت بڑا اہتمام کیا، تاکہ مسلمانوں کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ اہل بیتؑ کون ہیں اور آئندہ کوئی جھوٹ بول کر اہل بیتؑ میں شامل ہونے کی کوشش نہ کرے

---

[1] تفسیر سیوطی (۵/ ۱۹۹ – ۱۹۸)، صحیح ترمذی (۱۳/ ۲۴۷)، مسند احمد (۲/ ۲۹۲) و (۶/ ۳۰۶) اسد الغابہ (۴/ ۲۹) و (۸/ ۲۹۷) تہذیب التہذیب (۳/ ۲۹۷)

[2] مسند احمد (۱/ ۳۳۰) خصائص نسائی ص ۱۱/ ۵۰ – ۴، مجمع الزوائد ۹/ ۱۱۹ و ۲۰۷ و ۱۶۷ و ۱۶۹، صحیح ترمذی ۳/ ۱۷۲، ۱۷۱ و ۱۳/ ۲۴۸

اس لئے کئی ماہ تک ہر روز نماز صبح کے لئے تشریف لے جاتے وقت حضرت علیؑ کے دروازہ پر جاتے اور فرماتے:

"السلام علیکم یا اهل البیت، انما یرید الله لیذهب عنکم الرجس اهل البیت و یطهرکم تطهیرا۔"

"سلام ہو تم پر اے اہل بیتؑ۔ خدا کا بس یہ ارادہ ہے وہ خاندان نبوت سے ہر قسم کے رجس کو دور رکھے اور ہر طرح سے پاک رکھے۔"

رسول خداؐ کا یہ عمل اصحاب کے ایک گروہ نے دیکھا اور ان میں سے بہت اصحاب نے اہل بیتؑ کے تعارف کے سلسلے میں رسولؐ کے اس عمل کو بیان کیا۔[1]

عبد اللہ ابن عباس کہتے ہیں: "میں نے ۹ ماہ تک رسولؐ کے اس عمل کو دیکھا ہے۔"

ہلال ابن حارث، جن کو رسولؐ نے آزاد کیا تھا، کہتے ہیں کہ: میں نے آٹھ ماہ تک رسولؐ کا یہ عمل دیکھا ہے۔[2]

ابو برزہ صحابی نے سات ماہ کی مدت بیان کی ہے اور انس ابن مالک نے اس عمل کی مدت چھ ماہ بتائی ہے۔[3]

۱۔ درمنثور آیت وامر اهلک بالصلوة کی تفسیر کے ذیل میں، مجمع الزوائد ج ۹ ص ۱۶۸

۲۔ استیعاب ج ۲ ص ۵۹۸ اسد الغابہ ج ۵ ص ۱۴۲ و مجمع الزوائد ج ۹ ص ۱۶۸

۳۔ مجمع الزوائد ج ۹ ص ۱۶۹

اہل بیتؑ قرآن کے ہم پلہ ہیں

رسولؐ نے اہل بیت کو پہچنوانے کے سلسلہ میں جو بے پناہ زحمت برداشت کی ہے وہ اس مسئلہ کی اہمیت کی گواہ ہے جب بھی کوئی مناسب موقعہ ہاتھ آتا تھا پیغمبر اہل بیت کی عظمت و منزلت کو بیان فرماتے تھے اور ائمہ اہل بیت کی امامت کو بیان فرماتے تھے۔ ان روایات میں سے بعض کلی طور پر بارہ ائمہ کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں اور بعض میں ہر ایک امام کا نام اور مشخصات بھی موجود ہیں۔

حدیث ثقلین

اہل سنّت کے مشہور عالم ترمذی نے جابر ابن عبداللہ انصاری کے قول کو اس طرح نقل کیا ہے:

میں نے رسولؐ خدا کو روز عرفہ اور آخری حج میں دیکھا کہ اپنے مخصوص اونٹ پر تشریف فرما ہیں اور فرماتے ہیں:

"لوگو! میں اپنے بعد، تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑنے والا ہوں، اگر تم ان سے متمسک رہوگے تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے اور وہ ہیں کتاب خدا اور میرے اہل بیت عترت[1]"

---

[1] صحیح ترمذی ج ۱۳/ ۱۹۹ باب مناقب اہل بیت، کنزالعمال ج ۱ ص ۴۸

"ترمذی کہتے ہیں کہ ابو سعید خدری، زید ابن ارقم اور حذیفہ ابن اسید نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔"

صحیح مسلم، مسند احمد، سنن دارمی اور سنن بیہقی ..... میں زید ابن ارقم کا قول اس طرح نقل ہوا ہے[2]:

"لوگو! آگاہ ہو جاؤ میں بھی تمہاری طرح بشر ہوں اور عنقریب خدا کے فرستادہ کی آواز پر لبیک کہوں گا۔ میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑنے والا ہوں۔ ایک کتاب خدا ہے کہ جس میں نور و ہدایت ہے کتاب خدا سے تمسک اختیار کرو دوسرے میرے اہل بیت عترت ہیں۔"

یہی حدیث مستدرک الصحیحین اور حلیۃ الاولیاء میں بعبارت دیگر بیان ہوئی ہے۔ اہل سنت کے عالم حاکم کہتے ہیں، یہ حدیث صحیح ہے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ پیغمبرؐ نے اہل بیت کو کہ جنھیں خدا نے ہر رجس سے پاک رکھا ہے اور معصوم کہا ہے، قرآن کے برابر و ہم پلہ قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو دو گرانقدر چیزوں کا اتباع کرنے کا حکم دیا ہے اور ان ہی سے پناہ حاصل کرنے کی کی تاکید کی ہے تاکہ گمراہی سے بچے رہیں دوسرے یہ کہ قرآن و اہل بیت کو ایک دوسرے سے جدا نہ ہونے والا جانتے ہیں اور مسلمانوں کی سعادت اس بات میں جانتے ہیں کہ مسلمان ان دونوں سے تمسک کریں۔

---

[1] رسول خدا نے راہ مدینہ و مکہ میں واقع غدیر خم نامی تالاب کے کنارے ایک تقریر کی اور تقریر کے ضمن میں فرمایا۔

[2] صحیح مسلم باب فضل علی ابن ابی طالب مسند احمد ج ۴ ص ۳۶۶، سنن دارمی ج ۲ ص ۴۳۱

خلاصہ

① قرآن کے لحاظ سے وہی شخص منصب امامت پر فائز ہوسکتا ہے جو معصوم ہوگا۔ خداوند عالم قرآن میں خود ہر ایک گناہ سے محفوظ اشخاص کا تعارف کراتا ہے اور پیغمبرؐ کے اہل بیتؑ کو معصوم قرار دیتا ہے۔

② پیغمبر اکرمؐ نے بھی اہل بیتؑ کی عظمت و منزلت کو بیان کیا ہے، پیغمبرؐ کی نظر میں قرآن و اہل بیتؑ برابر ہیں اور ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے نیز مسلمانوں کی سعادت پیغمبرؐ کی ان ہی گرانقدر یادگاروں میں مضمر ہے۔

سوالات

① آیت تطہیر کن لوگوں کی شان میں نازل ہوئی ہے؟

② آیت تطہیر کے نزول کا واقعہ بیان کیجئے۔

③ اہل بیتؑ کے تعارف کے سلسلے میں پیغمبر اکرمؐ کا کردار بیان کیجئے۔

④ حدیث ثقلین سے آپ کیا سمجھتے ہیں۔

پانچواں سبق

خداوند عالم مسلمانوں کے ولی امر کا تعارف کراتا ہے

- بارہ امامؑ، حدیث پیغمبرؐ کی روشنی میں
- آیۂ ولایت
- ولایت کا انحصار
- خلاصہ
- سوالات

خداوند عالم مسلمانوں کے ولی امر کا تعارف کراتا ہے

ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ جو آیات و روایات امامت کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں، ان میں سے بعض کلی طور پر بارہ ائمہ کی امامت کے متعلق ہیں اور بعض میں ایک ایک کا نام اور خصوصیات ذکر ہوئے ہیں۔ خدا کی مدد سے اس درس میں ہم ہر ایک کا نمونہ ذکر کریں گے۔

بارہ امام، حدیثِ پیغمبرؐ کی روشنی میں

علمائے اہل سنت نے اپنی معتبر کتابوں میں رسولؐ خدا کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ میرے بعد بارہ [۱۲] امام ہوں گے۔ یہ حدیث درج ذیل کتابوں میں نقل ہوئی ہے:

۱۔ صحیح مسلم میں جابر ابن سمرہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ: "میرے والد نے کہا کہ رسولؐ خدا نے فرمایا: قیامت تک دین اپنی جگہ قائم ہے اور میرے بعد میرے بارہ جانشین ہوں گے جو کہ تمہارے ولی امر ہوں گے اور وہ سب قریشی ہوں گے"[۱]

---

[۱] صحیح مسلم ج ۶/ ۳ و ۴، صحیح بخاری ج ۴/ ص ۱۶۵، صحیح ترمذی ج ۹/ ص ۶۶

۲۔ بخاری نے روایت کی ہے کہ رسول خدا نے فرمایا :

" یہ امت اس وقت اپنی جگہ قائم و استوار رہے اور اپنے دشمنوں پر فتحیاب رہے گی جب تک میرے بارہ جانشین ، جو کہ سب قریش ہوں گے ، ان کے ولی امر رہیں گے "[۱]

۳۔ انس نے رسول خدا سے اس طرح روایت کی ہے :

" جب تک قریش کے بارہ افراد اس امت کے حاکم رہیں گے اس وقت تک یہ دین اپنی جگہ قائم رہے گا۔ "[۲]

۴۔ علمائے اہل سنت کی ایک جماعت نے اس حدیث کو "مسروق" سے اس طرح نقل کیا ہے :

ایک شب میں عبد اللہ ابن مسعود کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور وہ ہمیں قرآن کی تعلیم دے رہے تھے اسی اثنا میں ایک شخص نے پوچھا :

اے ابو عبد الرحمٰن کیا آپ نے رسول خدا سے یہ دریافت کیا تھا کہ اس امت میں ان کے کتنے جانشین ہوں گے ؟

ابن مسعود نے جواب دیا : جب سے میں عراق آیا ہوں اس وقت سے آج تک کسی نے مجھ سے ایسا سوال نہیں کیا تھا ، ہاں میں نے دریافت کیا تھا اور رسول نے فرمایا تھا :

۱۔ کنز العمال ج ۱۳ / ص ۲۷

۲۔ مسند احمد ج ۱ / ص ۴۰۶ و ۳۹۸ ، فتح الباری ج ۶ / ص ۳۳۹ مجمع الزوائد ج ۵ / ص ۱۹۰

"ان (میرے جانشینوں) کی تعداد نقبائے بنی اسرائیل کے
کے برابر ہے، یعنی وہ بارہ اشخاص ہیں۔[1]"

یہ تھے بہت سی روایات سے کچھ نمونے جو کہ علمائے اہل سنّت کی معتبر کتابوں سے نقل کئے ہیں۔ حدیث ثقلین میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ رسولؐ نے مسلمانوں کو قرآن و عترت کا اتباع کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس روایت میں بھی اپنے بعد ائمہ کی ایک جماعت کا ذکر کیا ہے: "جب تک یہ بارہ[۱۲] امام امت کے حاکم رہیں گے اس وقت تک یہ امت قائم و استوار رہے گی۔ جن روایتوں میں رسولؐ نے اپنے جانشینوں کی تعداد بیان کی ہے ان کا اطلاق ائمہ اہل بیتؑ کے علاوہ اور کسی پر نہیں ہوتا۔

آیۂ ولایت

انّما ولیکم اللّٰہ و رسولہ والّذین آمنوا الّذین
یقیمون الصّلوٰۃ و یوتون الزّکوٰۃ وھم راکعون۔[2]

"تمہارا ولی امر خدا، اس کا رسولؐ اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں، جو کہ ــ اس خصوصیت کے حامل ہیں کہ ــ حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔"

علمائے اہل سنّت اور شیعوں کی کتابوں میں اس آیت کی شان نزول کے

---

[1] مسند احمد ج ۱/ص۴۰۶ و ۳۹۸ احمد شاکری نے اس کے حاشیہ تحریر کیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے

[2] مائدہ/۵۵

سلسلہ میں نمایاں اصحاب، جیسے ابن عباس و ابوذر غفاری کے یہ اقوال نقل ہوئے ہیں کہ :

ایک روز مدینہ کا ایک بے نوا، مسجد رسولؐ میں داخل ہوا اور اپنی مفلسی بیان کرکے لوگوں سے اعانت طلب کی لیکن کسی نے بھی اس کی حاجت روائی نہ کی، حضرت علیؑ اس کی ناداری اور بیان سے بہت متاثر ہوئے چنانچہ آپؑ نے حالتِ رکوع ہی میں اپنی انگوٹھی اس کی طرف بڑھادی اور اس نے انگوٹھی اتارلی۔ ابھی نمازیوں میں سے کوئی شخص مسجد سے باہر نہیں گیا تھا کہ خدا کی طرف سے جبرئیل یہ آیت لے کر پیغمبر اسلام کی خدمت میں آئے۔

"تمہارا فرمانروا، خدا، اس کا رسولؐ اور وہ مومن لوگ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکواۃ دیتے ہیں۔"

ولایت کا انحصار

کلمہ ولایت کے محل استعمال کے پیش نظر اور ان کلموں کو دیکھتے ہوئے جو اس سے مشتق ہوئے ہیں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ولایت کے معنی محبت، دوستی نصرت اور تصرف و سرپرستی کے ہیں۔

والمومنون والمومنات بعضهم اولیاء بعض[۱]

اور مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں ان میں سے بعض کے بعض ولی

---

[۱] توبہ/۷۱

اور مددگار ہیں۔

هنالک الولایة لله الحق [1]

"وہاں خدا کی حکومت اور سرپرستی ہے۔"

الله ولی الذین آمنوا [2]

"اللہ ان لوگوں کا ولی ہے جو ایمان لائے ہیں"

آیت ولایت میں خداوند عالم فرماتا ہے: تمہارا حاکم — مسلمانو — صرف خدا، اس کا رسول اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور نماز میں رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔ یہاں خدا نے امت اسلامیہ کے لئے ایک شخص یا اشخاص کا تعارف ولی و سرپرستی کے لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ کرایا ہے اور اس کو منحصر جانا ہے۔ واضح ہے اس آیت میں لفظ ولی سے دوست مراد نہیں ہے کیونکہ یہ معنی کسی ایک شخص سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ تمام باایمان افراد سے اس کا تعلق ہے جیسا کہ ارشاد ہے: والمؤمنون والمؤمنات بعضهم اولیاء بعض مومن مرد اور مومن عورتوں میں سے بعض کے بعض ولی ہیں۔

اس بات کے پیش نظر کہ آیت نے ولایت کو اس خصوصیت کے ساتھ ایک شخص یا اشخاص سے مخصوص قرار دیا ہے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ولایت سے خاص نوعیت کی ولایت مراد ہے جس کے معنی سرپرستی اور حاکمیت کے ہیں۔

[1] کہف / ۴۴

[2] بقرہ / ۲۵۷

خلاصہ

١ کچھ آیات وروایات ایسی ہیں جو ائمہ کی امامت کو کلی طور پر بیان کرتی ہیں لیکن بعض ایسی بھی ہیں کہ جو ہر ایک امام کو نام اور خصوصیات کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔

٢ آیت ولایت ان آیتوں میں سے ہے کہ جو حضرت علیؑ کی امامت وولایت کو ثابت کرتی ہیں اور اس کے متعلق شیعہ، سنی کتابوں میں ایک واقعہ بھی نقل ہوا ہے (جس سے اس کا حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہونا ثابت ہوتا ہے)

٣ پیغمبر خدا نے اپنے بعد ہونے والے ائمہ کی تعداد بارہ بیان کی ہے جو کہ سب قریش سے ہوں گے اور رسول کی یہ حدیث ائمہ اہل بیتؑ کے علاوہ کسی اور پر صادق نہیں آتی۔

سوالات

١ آیت ولایت کس کی شان میں نازل ہوئی ہے؟

٢ آیت ولایت کی شان نزول اختصار سے تحریر کیجئے۔

٣ کلمۂ ولایت کے معنٰی بیان کیجئے۔

٤ آیت میں کلمہ ولایت کے کونسے معنی مراد لئے گئے ہیں؟

٥ کیا پیغمبر نے اپنے جانشینوں کی تعداد بیان کی ہے؟

چھٹا سبق

حدیث غدیر، امامت کو سرکاری طور پر امامت کا ابلاغ

- داستانِ غدیر
- غدیر کی قرارداد
- خدا کا دین امامت کے ذریعہ کامل ہوا
- غدیر کا پیغام
- شواہد و علامات
- خلاصہ
- سوالات

داستان غدیر

پیغمبر اسلام ہجرت کے دسویں سال مکہ کے اپنے آخری سفر سے واپس تشریف لارہے تھے، چونکہ یہ پیغمبرؐ کا آخری سفر تھا اس لئے اس حج کو حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اٹھارہ ذی الحجہ کو غدیر خم کے مقام پر، کہ جہاں مدینہ، شام اور مصر و مکہ کے کاروان آکر ملتے ہیں اور وہیں سے جدا ہوتے ہیں اور اپنے اپنے شہر و دیار کو لوٹتے ہیں، آپ پر وحی کے نزول کے آثار نمایاں ہوئے اور یہ آیت نازل ہوئی:

یا ایّہا الرّسول بلّغ ما انزل الیک من ربّک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس [1]

"اے رسول اس پیغام کو پہنچا دیجئے جو آپ کے پروردگار کی طرف نازل ہو چکا ہے اور اگر آپؐ نے ایسا نہ کیا تو گویا رسالت کا کوئی کام ہی انجام نہ دیا اور خدا تمہیں لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔"

اس آیت کے نزول کے بعد رسول خدا نے کاروان کو وہیں روک دینے کا حکم دیا اور فرمایا: جو لوگ آگے بڑھ گئے انھیں واپس بلاؤ اور پیچھے رہ جانے والوں کا انتظار کرو۔

---

[1] مائدہ/۶۵

جس قافلہ کے افراد کی تعداد تخمینہ کے طور پر ایک لاکھ بیس ہزار بتائی جاتی ہے، ممکن تھا شدید گرمی سے بچنے کے لئے اس میں سے کچھ لوگ پراگندہ ہو جائے اس لئے رسولؐ نے فرمایا: کوئی سایہ تلاش نہ کرے اور تمازت آفتاب سے فرار نہ کرے اور قطعی پراگندہ نہ ہوں۔

اس کے بعد فرمایا: خس و خاشاک اور خار وغیرہ کو صاف کیا جائے تاکہ جم غفیر کے لئے میدان فراہم ہو جائے۔ حاجیوں کا عظیم مجمع میدان میں جمع ہوگیا اور رسولؐ نے اس قیامت کی گرمی میں لوگوں کے ساتھ نماز ظہر ادا کی نماز کے بعد خطبہ دیا۔

پیمان غدیر

خطبہ کا آغاز آپؐ نے خدا کی حمد و ثنا سے کیا اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی یہاں تک کہ خطبہ طویل ہو گیا اور آخر میں فرمایا:

عنقریب مجھے بلایا جائے گا اور میں بھی لبیک کہوں گا
مجھ سے بھی سوال ہوگا اور تم سے پوچھا جائے گا تو
خدا کی بارگاہ میں تم میرے متعلق کیا کہو گے ؟

سب نے یک زبان ہو کر کہا : ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے اسلام کی تبلیغ کی اور ہماری ہدایت و رہنمائی کی، خدا آپ کو جزائے خیر عطا کرے۔

کیا تم خدا کی وحدانیت اور میری رسالت کی گواہی نہیں دیتے ہو ؟ کیا تم جنت و جہنم کی برحق ہونے کی گواہی نہیں دیتے ہو ؟

سب نے کہا ہم ان سب چیزوں کی گواہی دیتے ہیں۔
لوگو! میں تمہارے درمیان سے جا رہا ہوں۔ تم میرے پاس حوض (کوثر) پر وارد ہوگے ... وہاں میں تم سے ان دو گرانقدر چیزوں کے بارے میں پوچھوں گا جنھیں تمہارے درمیان یادگار چھوڑے جا رہا ہوں۔ پس سوچ سمجھ کر ان سے پیش آنا۔
اسی وقت مجمع میں سے کسی نے پوچھا: اے اللہ کے رسول وہ دو چیزیں کیا ہیں؟ فرمایا:
ایک کتاب خدا ہے کہ جس کا ایک سرا خدا کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا تمہارے پاس ہے اس کی تعظیم کرو اور اس کے احکام پر عمل کرنے کی کوشش کرو تاکہ گمراہی سے بچ جاؤ دیکھو! اس میں تحریف نہ کرنا۔
دوسرے میرے اہل بیت عترتؑ ہیں علیم و قدیر خدا نے مجھے اطلاع دی ہے کہ یہ دونوں (قرآن و اہل بیتؑ) ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک حوض کوثر پر میرے پاس وارد ہوں گے ...
کیا تم جانتے ہو کہ میں مومنوں کے نفسوں پر ان سے زیادہ حق تصرف رکھتا ہوں اور ان کا مولا ہوں؟
سب نے کہا: "بے شک"
کیا تم جانتے ہو کہ میں ہر مومن کے نفس پر خود اس سے زیادہ حق تصرف رکھتا ہوں اور اس کا مولا ہوں؟
سب نے کہا: ہاں اے اللہ کے رسولؐ۔

اس کے بعد رسولؐ خدا نے علیؑ کا ہاتھ پکڑا اور اتنا بلند کیا کہ اس جم غفیر نے دیکھا تو آپ نے فرمایا :

لوگو! خدا میرا ولی و سرپرست اور میں تمہارا ولی و سرپرست ہوں پس جس کا میں مولا ہوں اس کے علیؑ مولا ہیں پروردگارا ! ان کے دوست کو دوست اور ان کے دشمن کو دشمن رکھ ، ان کی مدد کرنے والے کی مدد فرما اور انھیں رسوا کرنے والے کو ذلیل فرما۔ علیؑ کی عزت کرنے والے کو عزت عطا کر اور ان پر غضبناک رہنے والے پر غضب نازل فرما۔ اے خدا تو گواہ رہنا!

خدا کا دین امامت کے ذریعہ کامل ہوا

ابھی رسولؐ اور علیؑ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے تھے کہ رسول خدا پر یہ آیت نازل ہوئی :

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔ [1]

"آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں اور دین اسلام کو تمہارے لئے پسند کر لیا۔"

اس آیت کے نازل ہونے پر رسولؐ نے دین کی تکمیل اور نعمتوں کے تمام ہونے پر تکبیر کہی اور فرمایا خدا میری رسالت اور علیؑ کی ولایت سے خوش ہو گیا

---

[1] مائدہ/۳۵

شواہد التنزیل میں مرقوم ہے:

روز غدیر جب رسول خدا فرزند ابو طالب کو امت کا ولی بنا چکے تو

عمر نے امام (علی) سے کہا:

"اے ابو طالب کے بیٹے! مبارک ہو آپ کو کہ آپ ہر مومن

کے مولا و سرپرست بن گئے۔"

غدیر کا پیغام

حدیث غدیر سند کے اعتبار سے محکم ہے اس میں کوئی خدشہ پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ بعض لوگوں نے اسی وجہ سے اس کی صراحت میں احتمال پیدا کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس کے پیغام میں تحریف کر سکیں۔ مثلاً بعض افراد نے کہا ہے: شاید حدیث غدیر میں وارد لفظ مولیٰ کے معنی دوست کے ہیں، سرپرست کے نہیں ہیں۔

ہم کہتے ہیں یہ بات ان روایات کے منافی ہے جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں، اس کے علاوہ بہت سے ایسے علامات و ثبوت موجود ہیں کہ جن سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس حدیث میں لفظ مولیٰ کے معنی سرپرست ہی کے ہیں

شواہد و علامات

۱۔ پیغمبر اکرم نے جملہ "من کنت مولاہ" فرمانے سے قبل ایک عبارت بیان فرمائی تھی کہ جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ لفظ مولا کے کیا معنی ہیں وہ

عبارت یہ ہے: ایھا الناس من اولی الناس بالمومنین من انفسھم؟ لوگو! مومنوں پر خود ان کے نفسوں سے زیادہ کون حق تصرف رکھتا ہے؟

پیغمبرؐ کی اولویت کے معنی یہ ہیں کہ ان کی خواہش دوسروں کی خواہشوں پر مقدم ہے اور تمام لوگوں کے ولی و سرپرست ہیں یہ ولایت عامہ رسولؐ کو خدا کی طرف سے ملی ہے۔ پھر غدیر میں رسولؐ خدا کی معنوی تقریر کی ہم آہنگی اور تناسب بھی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ لفظ مولیٰ کے وہی معنی ہونے چاہئیں جو کہ (اولی) پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

۲- واقعہ غدیر کے سلسلہ میں شاعروں نے بہترین قصیدے اور نظمیں کہی ہیں جو کہ واضح طور پر یہ بتاتی ہیں کہ لفظ "مولیٰ" سے مراد امامت اور امامؑ کی ولایت مطلقہ ہے، رسولؐ خدا کے شاعر حسان ابن ثابت نے اسی روز رسولؐ خدا کی اجازت سے آپؐ کی تقریر کو اشعار کی صورت میں پڑھا تھا۔ اس قصیدہ کے چند اشعار یہ ہیں:

فقال لہ قم یا علی فاننی رضیتک من بعدی اماما ھادیاً

فمن کنت مولاہ فھذا ولیہ فکونوا لہ اتباع صدق موالیاً

ھناک دعا اللھم وال ولیہ وکن للذی عادا علیاً معادیاً

(پیغمبرؐ نے) فرمایا: اے علیؑ اٹھو میں نے اپنے بعد تمہیں امام و پیشوا مقرر کیا ہے جس کا میں مولا ہوں اس کے علی مولا ہیں۔ پس (اے لوگو!) تم ان کے سچے پیرو کار بن جاؤ۔ پالنے والے علی کے دوست کو دوست اور ان کے دشمن کو دشمن رکھ

اسی طرح حضرت امیر المومنین اپنے چند اشعار میں، جو معاویہ کو لکھے تھے، فرماتے ہیں ؎

واوجب لی ولایته علیکم رسول اللہ یوم غدیر خم

"پیغمبر خدا نے غدیر کے روز اپنی ولایت کو میرے لئے تم پر واجب کیا"

۳۔ پیغمبرؐ نے اپنے خطبہ کے آغاز میں اپنی وفات کے متعلق فرمایا اور آخر میں لوگوں کو علیؑ کا تعارف کرایا اور اپنی مخصوص ولایت کا علی کو جانشین مقرر فرمایا۔

آخر میں اکمال دین، نعمت کے اتمام، اپنی رسالت اور علیؑ کی ولایت پر خدا کی خوشنودی پر تکبیریں کہیں۔

آخر کار مغرب کے وقت تک صحابہ، علیؑ کو مبارکباد پیش کرتے رہے چنانچہ ابوبکر و عمر نے سب سے پہلے آپؑ کو مبارک باد پیش کی تھی۔ یہ اور ایسے ہی دسیوں ثبوت ہیں جن سے ولایت عامہ ثابت ہوتی ہے اور حضرت علیؑ ان ہی معنیٰ میں مولا ہیں جن میں رسولؐ خدا مولا تھے۔

خلاصہ

۱) حجۃ الوداع سے لوٹتے وقت غدیر خم کے مقام پر نبی اکرمؐ پر آیت "بلّغ" نازل ہوئی اور پیغمبرؐ نے حاجیوں کے مجمع میں حضرت علیؑ کی ولایت سرکاری طور پر اعلان کر دیا۔

۲) غدیر خم میں رسولؐ نے حاجیوں کے بڑے مجمع کے ساتھ نماز ادا کی اور نماز کے بعد خطبہ دیا اور خطبہ کے ضمن میں حدیث ثقلین کا بھی تذکرہ کیا اور لوگوں کو اہل بیتؑ کی پیروی کا حکم دیا۔

۳) ابھی پیغمبرؐ و علیؑ جدا بھی نہیں ہوئے تھے کہ آیت اکمال دین نازل ہوئی اور علیؑ کی امامت پر دین کی تکمیل کا اعلان کر دیا گیا اس کے بعد لوگوں نے علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کرنا شروع کی۔

۴) حدیث غدیر سند کے اعتبار سے محکم اور دلالت کے لحاظ سے صریح ہے اس میں کسی قسم کے خدشہ کی گنجائش نہیں ہے۔

سوالات

۱) غدیر کہاں واقع ہے اور واقعہ غدیر کس سال رونما ہوا تھا؟

۲) رسولؐ کو امامت کی تبلیغ کا حکم کس آیت میں دیا گیا ہے؟

۳) پیغمبر اکرمؐ نے خطبۂ غدیر خم میں لوگوں کو کس بات کا حکم دیا؟

۴) امامت کی تبلیغ کے بعد آیت اکمال کے نزول سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

۵) حدیث غدیر میں جو لفظ "مولا" وارد ہوا ہے اس کے کیا معنی ہیں؟ وضاحت کیجئے۔

ساتواں سبق

علمائے اہل سنّت کیا کہتے ہیں؟

- تعیین امام کے طریقے:
  ۱- انتخابی امامت
  ۲- انتصابی امامت
  ۳- طاقت کے ذریعہ حاصل ہونے والی امامت
- عہد حاضر میں اسلامی حکومت کی تشکیل
- خلاصہ
- سوالات

علمائے اہل سنت کیا کہتے ہیں؟

علمائے اہل سنّت کہتے ہیں کہ پیغمبر خدا نے اپنا جانشین اور وصی معین نہیں کیا تھا، بلکہ خلیفہ کی تعیین کا مسئلہ خود لوگوں پر چھوڑ دیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سلسلہ میں ہم تک رسول خدا کی کوئی حدیث نہیں پہنچی ہے۔ اس بنا پر لوگوں کو چاہیئے کہ تعیین خلیفہ کے سلسلہ میں اقدام کریں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے مختلف راستے نکالے ہیں۔

تعیین امام کے طریقے

۱۔ انتخابی امامت

امام کے انتخاب کا ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگ ایک معیّن شخص کو امامت و خلافت کے لئے منتخب کریں۔ اہل سنّت کے عالم "قاضی ماوردی" لکھتے ہیں:

"..... ان افراد کی تعیین کے سلسلہ میں علماء کے درمیان اختلاف ہے جن کو اس انتخاب میں شرکت کرنا چاہیئے۔

ایک جماعت کا نظریہ ہے امام کا انتخاب امت کے صاحبانِ نظر

کے ذریعہ ہونا چاہئے تاکہ اس انتخاب کو امت کا ہر فرد قبول کرلے لیکن ابوبکر کی بیعت اس نظریہ کو باطل کرتی ہے کیونکہ انتخاب خلافت میں انھیں صرف ان لوگوں نے ووٹ دیا تھا جو وہاں موجود تھے۔ اس گروہ نے اس انتخاب میں دوسروں کی شرکت کا انتظار نہیں کیا تھا۔[1]"

ماوردی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ صرف وہ افراد جو سقیفۂ بنی ساعدہ میں موجود تھے، انہوں نے ہی اپنی بیعت کے ذریعہ ابوبکر کو خلیفہ چنا تھا اور انہوں نے مدینہ میں موجود نمایاں صحابہ، جیسے پیغمبر کے چچا عباس، دامادِ پیغمبر علی ابن ابی طالب اور تمام بنی ہاشم کا بھی انتظار نہیں کیا تھا چہ جائے مکہ، یمن، یمامہ، بحرین اور دوسرے اسلامی ممالک کے صاحبان نظر کا انتظار کرتے اور اس سلسلہ میں ان کی بھی رائے معلوم کرتے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ امت کے وہ چند افراد کون ہیں جو امام کی تعیین میں شریک ہوں تاکہ ان کی رائے سے امامت حاصل ہو جائے؟ اس سلسلہ میں تین نظریئے ہیں:

۱۔ ماوردی لکھتے ہیں: ایک گروہ کہتا ہے کہ امام کے انتخاب میں کم از کم امت کے پانچ صاحبان نظر افراد کی شرکت ضروری ہے، وہ امت کے لئے ایک شخص کو ووٹ دیں اور اس انتخاب میں ان کے درمیان اتفاق ہو۔
یا ان میں سے کوئی ایک دوسرے چار افراد کے مشورے سے

---

[1] احکام السلطانیہ ماوردی ص۷ طبع دوم ۱۳۸۶ھ

ایک شخص کو خلیفہ و امام مقرر کرے اور اس کی بیعت کرے۔

اس گروہ کی دلیل یہ ہے کہ ابوبکر کی بیعت امت کے پانچ صاحبان نظر نے کی تھی اور اس بات پر ان کا اتفاق تھا۔ اس کے بعد تمام لوگوں نے انکی پیروی کی اور ابوبکر کی بیعت کرنے لگے۔ وہ پانچ افراد یہ ہیں: عمر ابن خطاب، ابوعبیدہ جراح، اسید ابن حضیر، بشیر ابن سعد اور حذیفہ کا آزاد کردہ غلام سالم۔

دوسرے یہ کہ عمر نے اپنے بعد خلیفہ کا انتخاب چھ رکنی کمیٹی کے ذمہ کر دیا تھا اور یہ مقرر کر دیا تھا کہ ان ہی چھ میں سے ایک کو پانچ افراد خلیفہ چن لیں گے۔

۲۔ تین آدمی امام منتخب کریں۔ اس طرح کہ ایک آدمی ان میں سے کسی شخص کی بیعت کرے اور باقی دو آدمی اس انتخاب پر رضامندی کا اظہار کریں۔ بس امام کے انتخاب کے لئے یہ تین افراد ہی کافی ہیں ایسا انتخاب بالکل عقد نکاح کی طرح ہے کیونکہ اس میں ایک عقد کرنے والے اور دو گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔[1]

۳۔ ایک شخص بھی امام کا انتخاب کر سکتا ہے دلیل یہ ہے کہ رسولؐ کے چچا عباس نے علی ابن ابی طالب سے کہا:

"ہاتھ بڑھایئے تاکہ آپ کی بیعت کروں اور لوگ یہ کہیں کہ پیغمبرؐ کے چچا نے ان ــــ پیغمبر ــــ کے چچا زاد بھائی کی بیعت کر لی ہے پھر کوئی آپ کی

---

[1] احکام السلطانیہ ص۱۵

مخالفت میں نہیں اٹھے گا۔[1]

۲۔ انتصابی امامت

ماوردی اسی سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

"امام و خلیفہ کا انتخاب پہلے امام کی وصیت سے بھی ہو سکتا ہے اس کے صحیح ہونے میں علماء کا اتفاق ہے۔ دو تاریخی واقعات کو، جو کہ اس زمانہ کے مسلمانوں نے قبول کیا تھا، مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں:

ایک ابو بکر نے مرتے وقت عمر کو اپنا جانشین بنایا تھا اور اور مسلمانوں نے ابو بکر کے بعد عمر کی خلافت کو اسی وصیت کی بنا پر قبول کر لیا تھا۔

دوسرے عمر نے اپنے جانشین کی تعیین کے لئے چھ رکنی کمیٹی کی تشکیل کا فرمان جاری کیا ... عمر کی بیعت رسول ص کے تمام صحابہ کی رائے کی موافقت پر موقوف نہیں تھی۔ کیونکہ پہلے امام کی رضامندی اور صواب دید کو درجہ اول کی اہمیت حاصل ہے اور اپنے جانشین کی تعیین میں اس کا حق تمام اصحاب رسول ص کے حق پر مقدم ہے۔[2]

---

[1] احکام السلطانیہ ماوردی / ص ۸ و ۹

[2] احکام السلطانیہ ماوردی / ص ۱۰

۲۔ طاقت کے ذریعہ حاصل ہونیوالی امامت

اہل سنّت کے ایک دوسرے عالم کہتے ہیں :

"امامت انتخاب وچناؤ اور منصوب کرنے سے بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ طاقت و قوت کے بل پر بھی امامت حاصل کی جاتی ہے۔[1]

بنا بریں

جو شخص ملت اسلامیہ پر تلوار کے ذریعہ مسلط ہو جائے اور خلیفہ بن بیٹھے اور لوگ اسے امیر المومنین کہنے لگیں تو ہر اس مومن کو جو خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے یہ حق نہیں پہنچتا کہ رات سے صبح کو بیدار ہو اور اسے خلیفہ و امام اور پیشوا نہ مانے، خواہ خلیفہ پرہیزگار اور نیک منش ہو یا فاسق و ظالم، کیونکہ وہ امیر المومنین ہے اور اس کی اطاعت سب پر واجب ہے۔

اسی بحث میں آگے چل کر لکھتے ہیں :

ممکن ہے کوئی شخص ملک و طاقت حاصل کرنے کی غرض سے امام و خلیفہ کے خلاف قیام و شورش برپا کرے۔ ظاہر ہے اس وقت کچھ لوگ امام وقت کے پیرو ہوں گے اور کچھ قیام کرنے والے کے طرفدار ہوں گے تو ایسی صورت میں نماز جمعہ کے خطبہ میں

---

[1] احکام السلطانیہ قاضی، طبع اول ۷، و ۸ طبع دوم ص ۲۳ و ۲۳

فتحیات گروہ کے پیشوا کا نام لیا جائے گا۔ جیسا کہ حرہ کی جنگ میں
اس وقت پیش آیا تھا جب یزید نے اپنے مخالفوں کی سرکوبی
کے لئے مدینہ پر لشکر کشی کی تھی تو اس وقت عبداللہ ابن عمر نے
اہل مدینہ کے ساتھ نماز جمعہ قائم کی اور کہا ہم نماز میں اس شخص کا نام
لیں گے جو کامیاب ہے۔"

کلی طور پر علمائے اہل سنت کے اقوال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو کچھ
اسلام کی گزشتہ تاریخ میں اس سلسلہ میں واقع ہوا وہی دلیل وقانون ہے
اور وہی حکم خدا ہے۔

اور اس بات کے پیش نظر کہ خلفائے راشدین نے خلافت تک پہنچنے
کے لئے مختلف راستے اختیار کئے ہیں اس لئے علمائے اہل سنّت کے درمیان
اس سلسلہ میں اختلاف ہے۔

دور حاضر میں اسلامی حکومت کی تشکیل

علماء اہل سنّت کا ایک گروہ دور حاضر میں بھی اسلامی حکومت وخلافت
کو بیعت ہی کے طریقہ سے شرعی وقانونی سمجھتا ہے۔
اس اعتبار سے جب بھی کسی امام یا خلیفہ کا انتقال ہو جائے گا یا مستعفی ہو جائے تو
اس وقت لازم ہے کہ لوگ نئے حاکم کی بیعت کریں ایسی حکومت کے نمونے
جزیرہ العرب میں تلاش کئے جا سکتے ہیں جیسا کہ سعودی حکام اپنی حکومت کے

آغاز میں اپنے معتمد ترین لوگوں سے بیعت لیتے تھے۔

ایک گروہ نے اسلامی حکومت کو ڈیموکریسی کے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ کہا ہے کہ امام و ولی امر مسلمین کے انتخاب کا حق خود مسلمانوں کو حاصل ہے اور مسلمانوں کے صلاح و مشورہ سے اپنے رہبر و امام کا انتخاب کرنا چاہیئے۔

خلاصہ

۱) اہل سنت کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ کے جانشین کے لئے خدا کی طرف سے کوئی حکم نہیں آیا اس لئے لوگوں کو چاہیے کہ وہ خود اپنا خلیفہ و امام معین کریں۔

۲) امام کے تعین کے انہوں نے چند طریقہ بیان کئے ہیں: انتخابی امام، انتصابی امام اور طاقت و قوت کے ذریعہ بننے والا امام۔

۳) ایک گروہ نے دور حاضر میں اسلامی حکومت کی تشکیل کے لئے مسلمانوں کے مشورے کو انتخاب جانا ہے لیکن دوسرے گروہ نے امت کے معتمد ترین لوگوں کی بیعت کو معیار بتایا ہے اور حکومت کے قانونی ہونے کے لئے اس کو لازم بتایا ہے۔

سوالات

۱) امام کے تعین کے سلسلہ میں اہل سنّت کا کیا نظریہ ہے؟

۲) تعیین امام کے لئے انہوں نے کونسے طریقے پیش کئے ہیں؟

۳) انتخابی امامت کے قانونی اور شرعی ہونے کے سلسلہ میں ان کی کیا دلیل ہے؟

۴) کیا اہل سنّت کے لحاظ سے طاقت سے بھی خلافت حاصل کی جاسکتی ہے؟ وضاحت کیجئے۔

۵) دور حاضر میں اسلامی حکومت کی تشکیل کے متعلق ان کا نظریہ کیا ہے؟

آٹھواں سبق

امام کی رہبری کے ابعاد

- تبلیغِ احکام اور مذہبی مرجعیت
- امت کی حقیقی پناہ گاہ
- حکومت کی تشکیل اور سیاسی قیادت
- خلاصہ
- سوالات

امام کی رہبری کے ابعاد

تبلیغ احکام اور مذہبی مرجعیت

نہج رشد اور راہ سعادت کی طرف انسانوں کی ہدایت کے لئے خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ دستور العمل اور کچھ قوانین بھیجے ہیں۔ کتاب خدا بیان و تفسیر کی نیازمند ہے اور عام لوگ اس کے تمام مطالب کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ بنابرایں لوگوں کو احکام الٰہی تک پہنچنے کے لئے ایک مرجع کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور اس سے مستقل رابطہ رکھنا چاہئے اور وحی کے صاف و شفاف چشمہ سے فائدہ حاصل کرنا چاہئے:

وما انزلنا علیک الکتاب الاّ لتبیّن لھم الذی اختلفوا فیہ[1]

اور ہم نے تم پر یہ کتاب اسی لئے نازل کی تاکہ جن چیزوں میں لوگ جھگڑا کرتے ہیں تم ان کو کھول کر بیان کرو۔

جو کچھ اس کے پیغمبر پر خدا کی طرف سے نازل ہوتا ہے، اور پیغمبر اس کو

---

[1] نحل / ۶۴

لوگوں تک پہنچانے کے لئے مامور ہیں ، اس کی دو قسمیں ہیں ۔

۱۔ عین ان الفاظ و معنی کی تبلیغ جو خدا کی طرف سے پیغمبرؐ پر وحی ہوئی ہے جو کہ قرآن مجید کی صورت میں موجود ہے ۔

۲۔ رسول پر کچھ معنیٰ و مفہوم نازل ہوتے ہیں اس میں کوئی مخصوص لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ لہٰذا پیغمبر اپنے الفاظ میں اسے لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔

وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ [۱]

اور وہ تو اپنی خواہش نفس سے کچھ کہتے ہی نہیں، وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ وحی ہے جو ان پر نازل ہوتی ہے۔

تبلیغ احکام یہ ہے کہ رسولؐ نماز کی رکعات معین کرے اور اس کے ذکر، قرأت اور تسبیحات کو بیان کرے۔

پیغمبرؐ ہمیشہ لوگوں کے درمیان باقی نہیں رہتے ۔ پیغمبر کی وفات کے بعد لوگوں کا مرجع اور خدا کی طرف سے سچی پناہ ختم ہو جاتی ہے ۔ جب لوگ ایسے سرچشمہ تک نہ پہنچ سکتے ہوں اور احکام خدا کے حقیقی بیان کرنے والے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ہوں، تو لوگوں کو کس کی طرف رجوع کرنا چاہیئے ؟

امت کی حقیقی پناہ گاہ

پیغمبر اکرمؐ نے خود اس مسئلہ کا حل سوچا اور اس کو امت سے بتا دیا تاکہ

---

[۱] نجم / ۳

لوگ ان کے بعد سرگشتہ و گمراہ ہوں۔

ابوذر غفاری نے رسول خدا سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

علیؑ میرے علم کے باب ہیں۔ یہ میرے بعد لوگوں کے لئے ان چیزوں کو بیان کریں گے جن کے لئے میں مبعوث ہوا ہوں۔[1]

انس ابن مالک نے روایت کی ہے کہ رسولؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

انت تبین لامتی ما اختلفوا فیہ بعدی[2]

تم میرے بعد میری امت کے اختلاف کو رفع کرو گے اور اس کے لئے دین کی حقیقت کو آشکار کرو گے۔

اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ احکام خدا کو وہی شخص بیان کر سکتا ہے کہ جس کے علم کا سرچشمۂ وحی سے متصل ہو اور اس سے معنوی رابطہ رکھتا ہو۔ ایسا علم خاندان وحی و نبوت ائمہ اہل بیت کے پاس ہے اور امتیازی خصوصیت ان ہی سے مخصوص ہے۔

معتصم کے دربار میں ایک چور کو لایا گیا تاکہ اس پر وہ حد جاری کی جائے جو قرآن نے معین کی ہے، قرآن کا حکم ہے چور کے ہاتھ کاٹ دو۔

لیکن معتصم کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ہاتھ کہاں سے کاٹے جانے چاہئیں (اس نے) علمائے اہل سنت سے پوچھا: ایک نے کہا گٹے سے، دوسرے نے کہا کہنی سے۔

---

[1] کنز العمال طبع اول ج ۶ ص ۱۵۶

[2] کنز الحقائق ص ۱۸۸

معتصم مطمئن نہ ہوا ، ناچار دربار میں تشریف فرما ، نویں امام سے پوچھا۔ آپؑ نے فرمایا : چار انگلیاں کاٹی جائیں۔

— کیوں ؟

— اس لئے کہ خداوند قرآن میں فرماتا ہے : "المساجد للہ" سجدہ کرنے کی جگہیں خدا کے لئے ہیں۔ یعنی بدن کے سات اعضاء منجملہ ان کے ہاتھ کی ہتھیلی جس کو سجدہ کی حالت میں زمین پر رکھتے ہیں خدا کے لئے ہے ، اسے نہیں کاٹنا چاہئے ، اس بات کو سب نے قبول کیا اور امام کے استدلال سے سب مطمئن ہو گئے۔[1]

قرآن کی ایسی تفسیر اہل بیت عترت کا خاصہ ہے تفسیر کا کوئی کتنا ہی بڑا استاد کیوں نہ ہو وہ حق تفسیر ادا نہیں کر سکتا واضح رہے۔ یہ قرآن کے ظاہری احکام سے مربوط ہے جبکہ ان ہی ظاہری الفاظ و معنی میں بہت سے عمیق اور روحانی مقاصد مخفی ہیں۔ پیغمبرؐ فرماتے ہیں۔ ظاہری طور پر قرآن زیبا اور باطنی لحاظ سے عمیق ہے۔

ان تمام چیزوں کو اہل بیت عصمت ہی سمجھ سکتے ہیں اور وہی قیادت کر سکتے ہیں اسی لئے حدیث ثقلین میں رسولؐ نے انھیں قرآن کا ہم پلہ قرار دیا ہے اور دونوں (قرآن و اہل بیت) کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے اور امت کی سعادت کو ان دونوں کی پیروی میں منحصر جانا ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۵ / ص ۴۳۹

حکومت کی تشکیل اور سیاسی قیادت

امام کی قیادت صرف احکام بیان کرنے اور فردی اعمال و عبادات ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ معاشرہ کی قیادت بھی امام ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ نعرہ لگانا کہ "دین سیاست سے جدا ہے" اور پیکر اسلام سے امامت کو الگ کرنا حقیقت میں معاشرہ کو اسلام سے الگ کرنا ہے اور اس سعادت آفرین مکتب کو کھوکھلا بنانا ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ اسلام کا معاشرہ میں وجود رہے اور اس کے سرسبز درخت کے سایہ میں زندگی گزاریں، اگر اپنی جنبش و تحریک کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں اور انسانوں کے بے جان معاشرہ کو زندہ کرنا چاہتے ہیں تو امامت کے اصولوں پر معاشرہ استوار کرو۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سی روایات میں آیا ہے کہ اسلام چند پایوں پر استوار ہے اور ولایت ان میں سب سے محکم اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر استوار ہے اور وہ ہیں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور ولایت؛ اصحاب امامؑ میں سے زرارہ پوچھتے ہیں ان میں سب سے اہم پایہ کون ہے؟ امامؑ نے فرمایا: ولایت سب سے اہم ہے مزید وضاحت فرماتے ہیں: کیونکہ امامت و ولایت، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی کلید ہے[1]۔

---

[1] وسائل ج ۱ ص

خلاصہ

(۱) خدا کے دستورات اور قوانین تفسیر و بیان کے محتاج ہیں عام آدمی ان سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا، پیغمبر اکرم خدا کی طرف سے تبلیغ احکام اور آیات کی تفسیر بیان کرنے پر مامور تھے

(۲) اس ضرورت کے پیش نظر رسولؐ نے علی کو مطمئن کرنے والے مرجع کی حیثیت سے پہچنوایا تھا تاکہ لوگ اپنی مشکلات میں انکی طرف رجوع کریں۔

(۳) امام کی قیادت صرف احکام بیان کرنے اور قرآن کی تفسیر کرنے ہی میں محدود نہیں ہے بلکہ معاشرہ میں تمام احکام خدا کو نافذ کرنا بھی اس کی ذمہ داری ہے کہ جس کے لئے حکومت کی ضرورت ہے اور لوگوں کی سیاسی قیادت کی باگ ڈور بھی امام ہی کے ہاتھ میں ہونی چاہئے۔

سوالات

(۱) کیا لوگ خدا کے قوانین اور آسمانی کتاب کی کامل طور پر تفسیر کر سکتے ہیں۔

(۲) پیغمبر کے ذریعہ آیات الٰہی کی تبلیغ کی قسمیں لکھئے۔

(۳) کیا پیغمبرؐ نے اپنے بعد اختلاف کے حل کے لئے کسی کو مرجع کے عنوان سے پہچنوایا ہے؟

(۴) کون اشخاص تفسیر کا حق ادا کر سکتے ہیں؟

نواں سبق

باطنی رہبری اور معنوی ہدایت

- معنوی ہدایت
- حیات معنوی
- خلاصہ
- سوالات

باطنی رہبری اور معنوی ہدایت

معنوی ہدایت

پیغمبر اسلام نے اسلام کے منصوبوں اور پروگراموں کو اسلامی حکومت کے سایہ میں عملی جامہ پہنایا۔ آپ لوگوں کے سیاسی رہبر بھی تھے اور قاصد وحی کے ذریعہ خدا کے بھیجے ہوئے اسلامی قوانین واحکام بھی حاصل کرتے تھے اور لوگوں تک پہنچاتے تھے اور انہیں اسلام واحکام خدا سے آشنا کرتے تھے۔

البتہ اسلام کے قوانین فقط اس دنیا اور مادی زندگی میں محدود نہیں ہیں اسلام بشر کے بنائے ہوئے مکتبوں کی مانند نہیں ہے کہ جس نے صرف مادی افق پر آنکھیں لگا رکھی ہیں اور انسانی سعادت کو اسی مادی زندگی میں منعکس کرتے ہیں، اسلام نے مادی اور دنیوی زندگی کے علاوہ بہم، کسب معنویت و فضیلت کے وسیع منصوبے بنائے ہیں۔

ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم یتلوا علیھم ایاتک ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ ویزکیھم انک انت العزیز الحکیم ؎

؎ بقرہ / ۱۲۹

"ہمارے پروردگار! ان میں ان ہی میں سے ایک رسول کو بھیج جو
ان کے سامنے تیری آیتوں کی تلاوت کرے اور انھیں کتاب و
حکمت کی تعلیم دے اور انھیں پاک کرے بے شک تو غالب و حکیم ہے"

اس معنوی ارتقاء کو تمام لوگ درک نہیں کر سکتے۔ اس رفتِ نو کی شناخت
ان افراد کا خاصہ ہے جو ایمان کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں ہر ایک میں اس راہ
پر گامزن ہونے اور اس فضا میں سانس لینے کی ہمت نہیں ہے چہ جائے کہ اس
مادی دنیا میں قیادت کرے۔

اس راستے کو طے کرنے کے لئے ظریف و دقیق خصوصیت درکار ہے اور
مادی زندگی میں صحیح راستہ پالینا بہت ہی دشوار ہے کیونکہ آدمی بدن کے
لحاظ سے جان و روح بہت ہی ظریف و لطیف ہے۔

بنابرایں اس دنیا میں وہی رہبری کر سکتا ہے جس کی روح و جان اس
دنیا کے علاوہ عالم غیب سے بھی تعلق رکھتی ہو اور وہ اس دنیا کے افراد سے
واقفیت رکھتا ہو۔ پروردگار نے اپنے بے پناہ لطف سے ہمیشہ بشر کی ہدایت کیلئے
ایسے ہی رہبر بھیجے تاکہ انسانوں کی عالی و مضطرب روح کی سعادت و رستگاری
کی طرف رہبری کریں۔

حیات معنوی

اس بات سے قطع نظر کہ اسلام نے وجودِ انسان پر خاص توجہ دی
ہے، اور پاکیزہ روح اور صحیح و سالم نفسیات کی طرف اس کی راہنمائی کی ہے

قرآن مجید کی چند آیتیں اس چیز کی طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ اگر انسان صفائے قلب اور ایمان کی بلندی کے ساتھ آسمانی قوانین پر عمل کرے تو اسے یقیناً حیات معنوی نصیب ہوگی۔

من عمل صالحًا من ذکر وانثیٰ وھو مومن فلنحیینہ حیواۃ طیبۃ[1]

"مرد و عورت میں سے جو بھی نیک کام کرے گا جبکہ وہ مومن بھی ہو تو ہم اسے پاکیزہ حیات عطا کریں گے۔"

واضح ہے کہ جو زندگی قرآن کریم کی ان آیتوں میں بیان ہوئی ہے وہ ظاہری زندگی کے علاوہ ہے۔ پاکیزہ حیات نیک کردار اور نفس کے تزکیہ سے حاصل ہوتی ہے ورنہ مادی زندگی تو سب ہی کو نصیب ہے لیکن قرآن چاہتا ہے کہ ان ہی لوگوں کو معنوی زندگی سے سرشار کرے جو مادی زندگی سے بہرہ مند ہیں، انھیں معنویت کے صاف و شفاف چشمہ سے سیراب کرے۔

یہ معنوی حیات انسان کے اس کردار کا نتیجہ ہے، جو آسمانی رہبروں نے سکھایا ہے۔ قرآن کی زبان میں، جو شخص معنوی حیات کا خواستگار ہے اسے نیک اعمال انجام دینے چاہئیں اور صفائے قلب از روئے ایمان خدا کے احکام پر عمل کرنا چاہئے تاکہ اس کے قلب میں حیات معنوی پیدا ہو جائے، ایسے انسان کی مثال اس بچہ کی سی ہے جو تحت تربیت ہو اور مربی کے

---

[1] نحل / ۹۷

امر و نہی کو سنتا ہو اور جو معلم کہتا ہے اسے بغیر چون و چرا انجام دیتا ہو، اگرچہ وہ یہ نہیں جانتا کہ اس میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے اور اس کا کیا فائدہ ہے۔ لیکن تربیت کا زمانہ گزارنے کے بعد اخلاق اور پسندیدہ روش کے نقطہ نظر سے جس سے وہ باطنی طور پر آراستہ ہو چکا ہے، سعادت مندی کی زندگی گزارے گا۔

البتہ جو اشخاص حیات معنوی کے طلب گار ہیں وہ اپنی ہمت پر اعتماد کرکے بغیر رہبر کے اس راستہ کو طے نہیں کر سکتے لیکن اگر ایسے راہنما کی اقتداء میں اس راہ پر گامزن ہوں اور حیات معنوی اور سعادت اخروی کو حاصل کرنے کی کوشش کریں تو امام اس کی راہنمائی کرتا ہے اور شک و تردید کی حالت میں اس کے قلب کو اطمینان بخشتا ہے اور ان طوفانوں میں کہ جن میں چند قدم آگے کا بھی دکھائی نہیں دیتا، امام کا نور ہدایت ان لوگوں کے دلوں کو منور کرتا ہے اور ان کی راہنمائی کرتا ہے جو مستحق ہیں اور صلاحیت رکھتے ہیں۔[۱]

---

[۱] اس سلسلہ میں مزید نمونے "دو رسالے از اصول دین" ص۲۴۴ و ص۲۶۴ ملاحظہ فرمائیں۔

خلاصہ

۱. اسلام کے قوانین فکر بشر کے خود ساختہ مکاتب کی طرح نہیں ہیں جو کہ صرف انسانی سعادت کو خاکی و مادی دنیا میں بیان کرتے ہیں، اسلام نے انسان کے مادی پہلو کے علاوہ اس کے وجود کے دوسرے پہلو کو بھی مدنظر رکھا ہے اور انسان کی حیات معنوی کے لئے نقشہ کشی کی ہے۔

۲. قرآن کے لحاظ سے جو شخص بھی شائستہ کردار کا حامل اور ایمان کے بلند درجہ پر فائز ہوگا اسے حیات معنوی نصیب ہوگی اور اس سے بہرہ ور ہوگا۔

۳. جو لوگ حیات معنوی کے خواہش مند ہیں اور انھوں نے خدا کے معین کردہ رہبروں کے ساتھ اس راہ کو طے کیا ہے وہ حوادث کے وقت اور اضطراب میں تنہا نہیں رہتے ہیں بلکہ امام ان کی راہنمائی کرتا ہے اور باطنی طور پر حق کا راستہ دکھاتا ہے اور اس کا نور ہدایت ان کے دل سے تزلزل و تردد کو نکال دیتا ہے۔

۱. کیا اسلام نے انسان کی حیات معنوی پر توجہ کی ہے؟

۲. کس طرح انسان حیات معنوی کو حاصل کر سکتا ہے؟

۳. کیا انسان اپنی حیات معنوی میں بھی راہنمائی کا محتاج ہے؟

۴. امام کی باطنی ہدایت کی وضاحت کیجئے۔

دسواں سبق

مثالی معاشرہ اور عالمی حکومت

مثالی معاشرہ اور عالمی حکومت

انسان عرصۂ دراز سے اپنی جائے پیدائش زمین پر اجتماعی زندگی گزار رہا ہے، وہ ہمیشہ کامیاب اجتماعی زندگی کی امید میں زندہ رہا ہے اور اس کے لئے مستقبل پر نظر امید لگائے رہا ہے۔ صاحبان قلم نے مثالی مستقبل کی نشاندھی کی ہے اور انسانوں کے پسندیدہ اور اچھے تعلقات، صلح و آشتی، علمی ترقی، خوشحالی و نیک بختی اور انسان کی کامل سعادت کو قلم بند کیا ہے۔

دانشوروں نے مثالی معاشرہ کا تجزیہ و تحقیق کی ہے اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے کچھ راستوں کی نشاندھی کی ہے اور مختلف زمانوں میں اس کے متعلق متعدد کتابیں تحریر کی ہیں[1]

فکر بشر کے خود ساختہ مکاتب اور ادیان الٰہی سے قطع نظر، مثالی معاشرہ کی عکاسی کے لئے، تمام لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ پوری دنیا مثالی معاشرہ کے انتظار میں ہیں جبکہ مستقبل امیدوں سے لبریز ہے، اس امید کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے اور نہ ہی انسان کی طبیعت و فطرت میں اس کی امید نے نقش پیدا کیا ہے اور نہ انسان کے افکار و خیالات میں اس کا تصور پیدا ہوا ہے

---

[1] مثلاً افلاطون کی "مدینہ فاضلہ"، کامپانلا کی "کشور خورشید"......

چنانچہ اگر غذا نہ ہوتی تو بھوک کا بھی وجود نہ ہوتا اور اگر پانی نہ ہوتا تو پیاس کا بھی وجود نہ ہوتا۔

یہ حیات بخش اور مستقبل کو روشن کرنے والا انتظار علاوہ اس کے کہ اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ انسان جس عالمی معاشرہ کی امید میں زندگی گزارتا آیا ہے وہ قائم ہوگا، انسان کو عشق و امید دے سکتا ہے اور اس کی سرشت میں ایک ایسا محرک ایجاد کرسکتا ہے جو اپنی کوشش اور جانفشانی سے اپنے ارمان پورا کرنے کی راہیں تلاش کرسکتا ہے اور اس کے مبادیات فراہم کرسکتا ہے یہ راستہ روشن ہے کہ امیدوں کو زندہ کرتا ہے، اور انسان میں ولولہ پیدا کرتا ہے اور معاشرہ میں تعمیری انتظار کو وجود بخشتا ہے۔

انتظار کا عام مفہوم

انتظار کے عام مفہوم پر انسانی مکاتب فکر اور آسمانی مذاہب سب ہی متفق ہیں اور رسل کے بقول: "مارکس کو بھی وہی انتظار ہے جو مسیح کی رجعت ثانی کا مسیحیوں کو ہے[1]"

سب ہی اس انتظار میں ہیں کہ ایک عدل گستر آئے اور انسان کو ان گردابوں سے نجات دلائے جو کہ اسے نگلنے کے لئے منہ پھاڑے کھڑے ہیں اور ان منہ زور موجوں سے نجات دلائے جو کہ اس کو نابود کردینا چاہتی ہیں

---

[1] درک تاریخ ۱۵

اور امید کے ساحل تک پہنچا دے ۔

اگرچہ اس نجات دلانے والے کے سلسلہ میں اختلاف ہے اور مستقبل کے سعادتمند معاشرہ کے بارے میں متحد نہیں ہیں ۔

کمیونسٹ مستقبل کے معاشرہ کی سعادتمندی کا سبب مزدور کو جانتے ہیں۔ اور سرمایہ دار (CAPITALISM) کے نقط نظرے اس کا مالک حکمراں طبقہ ہوگا اس میں بہت سے ملک کمپنیوں کی صورت میں شامل ہوں گے، جن کے ہاتھ میں پوری دنیا کا اقتصاد ہوگا لیکن کوئی مخصوص حکومت نہیں ہوگی ۔

قرآن میں اس بات کا وعدہ کیا گیا ہے کہ صرف مزدور اور سرمایہ دار کامیاب نہیں ہیں بلکہ حق کے شیدائی اور نیک لوگ کامیاب ہوں گے اور وہی زمین کے وارث ہوں گے۔[1]

۱۔ ولقد کتبنا فی الزّبور من بعد الذّکر انّ الارض یرثھا عبادی الصالحون (انبیاء/۱۰۵)

"اور ہم نے ذکر (توراۃ) کے بعد زبور میں لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔"

۲۔ ھوالّذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین

---

[1] ایک گروہ "کام" ہی کو اصل تاریخ و وقوعہ جانتا ہے اور دوسرا "سرمایہ" کو اصل جانتا ہے جبکہ قرآن حق کو اصل قرار دیتا ہے اور اس کے پیروکاروں کو کامیاب جانتا ہے ۔

کلّہ ولوکرہ المشرکون (صف/۹)

اسی نے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث کیا تاکہ وہ تمام مذاہب پر غالب آجائے اگرچہ مشرکین کو یہ بات ناگوار ہی گزرے۔

۳۔ وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملو الصالحات لیستخلفنّھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکننّ لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنّھم من بعد خوفھم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً۔

(نور/۵۵)

"تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام انجام دیئے ان سے خدا نے وعدہ کیا ہے کہ انھیں روئے زمین پر ضرور خلیفہ بنائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا اور جس دین کو خدا نے ان کے لئے پسند کیا ہے اس پر انھیں ضرور قدرت عطا کرے گا اور ان کے خوف کو امن وامان سے بدل دے گا، وہ میری (خدا) ہی عبادت کرتے ہیں اور کسی کو میرا شریک نہیں ٹھہراتے۔"

۴۔ ونرید ان نمنّ علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم ائمّۃ ونجعلھم الوارثین (قصص/۵)

ہمارا ارادہ ہے کہ جو لوگ روئے زمین پر کمزور کر دیئے گئے ہیں ان پر احسان کریں اور ان ہی کو لوگوں کا پیشوا اور زمین کا وارث بنائیں۔

انتظار کا خاص مفہوم

حضرت مہدیؑ کے ظہور اور ان کے نسل پیغمبرؐ سے ہونے کے بارے میں بے شمار حدیثیں شیعہ و سنی طرق سے وارد ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سی روایات ایسی ہیں کہ جن میں آپؑ کو امام حسن عسکریؑ، گیارہویں امام کا فرزندِ بلا فصل قرار دیا گیا ہے اور یہ کہ آپؑ ولادت اور طولانی غیبت کے بعد ظہور فرمائیں گے۔ اور دنیا کو اسی طرح عدل و انصاف سے پر کریں گے جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔ بہت سی روایات کا مفہوم یہ ہے کہ امام بارہ ہیں اور وہ سب قریش سے ہوں گے امام مہدیؑ کا نام اور ان کا امام حسینؑ کی اولاد سے ہونے کی تصریح موجود ہے۔ اہل سنت کی ستّر سے زیادہ معتبر کتابوں میں سیکڑوں حدیثیں نقل ہوئی ہیں اور ان کے بعض دانشوروں نے امام مہدیؑ کے سلسلہ میں مستقل طور پر کتاب لکھی ہے۔

امام مہدیؑ کی معرفت

امام مہدیؑ کے نسب کی تعیین اور آپؑ کے تعارف کے سلسلہ میں پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ طاہرینؑ سے بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں جو کہ حد تواتر کو

پہنچی ہوئی ہیں۔ ان کے حدیثوں کے بعد حضرت مہدیؑ کی معرفت کے لئے شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

ہم یہاں پر فہرست وار ان احادیث کو سند کے ساتھ نقل کر رہے ہیں جو "منتخب الاثر" میں نقل ہوئی ہیں۔

۱۔ "امام بارہ ہیں ان میں پہلے علیؑ اور آخری مہدیؑ ہیں۔"

(حدیث ۹۱)

۲۔ "امام بارہ ہیں ان میں کے آخر مہدیؑ ہیں۔"

(حدیث ۹۴)

۳۔ "امام بارہ ہیں اور ان میں سے نو امام حسینؑ کی اولاد سے ہوں گے اور نویں، حضرت قائمؑ ہیں۔"

(حدیث ۱۰۷)

۴۔ "بارہ ائمہ کے نام۔"

(حدیث ۵۰)

۵۔ "مہدیؑ اہل بیتؑ پیغمبر سے ہیں۔"

(حدیث ۳۸۹)

۶۔ "مہدیؑ کا نام پیغمبر کا نام اور ان کی کنیت پیغمبرؐ کی کنیت ہے، اور وہ سب سے زیادہ پیغمبر سے مشابہ ہیں۔"

(حدیث ۴۸)

۷۔ "رخسار مہدیؑ کی شرح۔"

(حدیث ۲۱)

۸۔ "مہدیؑ امام حسینؑ کی نسل سے ہونے والے نو ائمہ میں سے ایک ہیں۔"

(حدیث ۱۶۰)

۹۔ "حضرت مہدیؑ تیسرے امام، حسینؑ ابن علیؑ کی نسل سے نویں امام ہیں۔"

(حدیث ۱۴۸)

۱۰۔ "چوتھے امام، حضرت علیؑ ابن الحسین کی نسل سے آٹھویں امام حضرت مہدیؑ ہیں۔"

(حدیث ۹۴)

۱۱۔ "پانچویں امام محمد ابن علیؑ الباقر کی نسل سے ساتویں امام حضرت مہدی ہیں۔"

(حدیث ۹۲)

۱۲۔ "چھٹے امام جعفرؑ صادق کی نسل سے چھٹے امام حضرت مہدی ہیں۔"

(حدیث ۹۹)

۱۳۔ "ساتویں امام موسیٰ بن جعفر کی نسل سے پانچویں امام حضرت مہدیؑ ہیں۔"

(حدیث ۹۸)

۱۴۔ "آٹھویں امام علیؑ ابن موسیٰ الرضا کی نسل سے چوتھے امام حضرت مہدیؑ ہیں۔"

(حدیث ۹۵)

۱۵۔ "نویں امام علی نقیؑ کی نسل سے تیسرے امام حضرت مہدیؑ ہیں۔"

(حدیث/ ۹۰)

۱۶۔ "دسویں امام علی ابن محمد الھادی کی نسل سے دوسرے امام حضرت مہدی ہیں۔"

(حدیث ۹۰)

۱۷۔ "گیارہویں امام حسن عسکری کے فرزند حضرت امام مہدیؑ ہیں۔"

(حدیث ۱۴۶)

۱۸۔ "حضرت مہدیؑ بارہویں امام ہیں۔"

(حدیث ۱۴۶)

حضرت مہدی، خورشید عدالت

المهدی یملأ ارض قسطا وعدلا کما ملئت ظلماً وجوراً [1]

[1] منتخب الاثر ص ۲۴۷

"مہدیؑ زمین کو عدل و انصاف سے ایسے ہی پر کرے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھری ہوگی۔"

یہ پیغمبرؐ اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی حدیث ہے جو کہ شیعہ و سنی دونوں کی کتابوں میں بہت سی احادیث کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

صرف مہدیؑ وہ انسان ہیں جن کے ذریعہ روئے زمین سے ظلم و فساد کا خاتمہ ہوگا، انھیں کے توسط سے روئے زمین پر الٰہی قوانین کا نفاذ ہوگا اور تمام انسانوں کے درمیان عدل قائم کریں گے۔

یہ خدا کی آخری حجت کی خصوصیت ہے وہ خدا کی قدرت اور خدائی اعجاز سے اپنے معدود اصحاب کے ساتھ، کہ جن کی تعداد بعض روایات میں ۳۱۳ بتائی گئی ہے، ظلم و ستم سے لبریز دنیا کو دنیائے عدالت و انصاف کی طرف لے جائیں گے اور دنیا کو ظلم و ستم سے پاک کر دیں گے۔

انتظار فرج کا تعمیری اثر

عالمی امن اور کشادگی اور دنیا کو ظلم سے نجات دلانے کے کامل مصداق حضرت مہدیؑ ہیں پیغمبر اکرمؐ کا ارشاد ہے:

افضل اعمال امتی انتظار الفرج من اللہ عز وجل[1]

---

[1] بحار الانوار ج ۵۲/ص ۱۲۹

"میری امت کے بہترین اعمال خدا کی طرف سے کشادگی اور امن کا انتظار ہے۔"

حدیث میں وارد لفظ انتظار الفرج کے معنی عدالت کے قائم ہونے اور ظلم و مصیبتوں سے رہائی کی امید رکھنے، مظہر حق اور خورشید عدالت حضرت مہدی ع سے عشق رکھنے، عدل کا شیفتہ ہونے دوسروں کے حقوق کا احترام کرنے، تقویٰ اختیار کرنے، عدل قائم کرنے کے لئے کوشاں رہنے اور ستم دیدہ لوگوں کو ظلم و ستم سے نجات دلانے کے ہیں۔

انتظار فرج مہدی ع کی فضیلت کے سلسلہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"تم میں سے جو بھی دین خدا کی حاکمیت کے ظہور کے انتظار میں دنیا سے اٹھتا ہے اس کی مثال اس شخص کی ہے جو امام مہدی ع کے خیمہ میں ہو... بلکہ اس شخص کی مانند ہے جو کہ امام مہدی ع کے ہمرکاب ہو کر جنگ کرے۔ قسم خدا کی اس شخص کے مثل ہے جو پیغمبر کے ہمرکاب جنگ کرتے ہوئے شہید ہوا ہو۔[1]"

جی ہاں جو شخص امام زمانہ کے مددگاروں میں شامل ہونا چاہتا ہے اسے تقویٰ، پاکیزگی، عدالت پسندی اور عدل کے مطابق عمل کرنے کی پوری کوشش کرنا چاہئے اور اسلام اور اسلامی سرزمینوں کو دشمنوں کے حملہ

---

[1] بحار الانوار ج ۵۲ ص ۱۲۶

بچانے کے لئے کوشاں رہنا چاہئے۔

حضرت مہدیؑ کے ظہور میں تاخیر کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ لوگ اس عہد و پیمان کو پورا کرنے کے سلسلہ میں باوفا نہیں ہیں جو آل محمدؐ کی مدد کے بارے میں کیا تھا جیسا کہ امام مہدیؑ نے اس پیغام میں فرمایا ہے جو کہ شیخ مفید کو بھیجا تھا:

"اگر ہمارے شیعہ متفق و متحد ہو گئے ہوتے اور اپنے عہد کو وفا کرتے تو یقیناً میرے ظہور میں تاخیر نہ ہوتی اور لوگ بہت پہلے ہماری زیارت سے مشرف ہوئے ہوتے" [۱]

امام زمانہ کی ملاقات سے محروم رہنے کی وجہ خدا کے احکام کی نافرمانی ہے، چنانچہ شیخ مفید کے نام آپؑ کے پیغام میں نقل ہوا ہے:

"اگر شیعوں کی روش نامناسب نہ ہوتی تو یقیناً میری ملاقات سے سرفراز ہو گئے ہوتے۔" [۲]

۱۔ احتجاج طبرسی ج ۲ ص ۳۲۵

۲۔ بحار الانوار ج ۵۳ ص ۱۷۶

خلاصہ

۱. انسان ہمیشہ مثالی معاشرہ کی امید میں زندگی گذارتا ہے یہ امید انسان کو توقع دلوانے کے علاوہ کوشش و جانفشانی پر بھی ابھارتی ہے گویا یہ حقیقت ہے کہ ایسا مثالی معاشرہ وجود میں آئے گا۔

۲. شیعہ وسنی طریق سے ایسی بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں کہ جن سے یہ معلوم ہوتا کہ امام مہدیؑ اہل بیتؑ اور امام حسینؑ کی نسل سے ہوں گے اور طولانی غیبت کے بعد ظہور فرمائیں گے اور دنیا کو اسی طرح عدل وانصاف سے پر کریں گے جیسے وہ ظلم وجور سے بھر چکی ہوگی۔

۳. حضرت مہدیؑ کا عالمی انقلاب اور عظیم تحریک عالمی سطح اور وسیع پیمانہ پر تبدیلیاں لائے گا کوئی انقلاب بھی زمین ہموار کرنے کے بغیر نہیں آتا ہے اور انتظار فرج درحقیقت اس انقلاب کے لئے زمین ہموار کرتا ہے۔

۱. کیا بشریت کا مستقبل روشن ہے؟ وضاحت کیجئے۔
۲. انتظار کا عام مفہوم کیا ہے؟
۳. انتظار کا خاص مفہوم کیا ہے؟
۴. مستقبل کی بشریت کے سلسلہ میں قرآن کا کیا نظریہ ہے؟
۵. مثبت ومنفی انتظار کی وضاحت کیجئے۔

گیارہواں سبق

پوشیدہ آفتاب

- غیبت سنّت ہے
- غیبتِ صغریٰ
- غیبت کبریٰ
- عہد طفلی میں امامت
- طُولِ عمر کا مسئلہ
- خلاصہ
- سوالات

پوشیدہ آفتاب

غیبت سنّت ہے

امت کے آسمانی رہبر کا غائب ہونا حضرت مہدیؑ ہی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ ایک سنّت الٰہی ہے جو پہلی امتوں میں بھی جاری رہی ہے۔ اس طرح کہ کبھی کوئی پیغمبر اپنی قوم سے کنارہ کش ہو جاتا تھا اور امت کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا تھا۔ (جیسے حضرت صالحؑ و حضرت موسیٰؑ)

دوسری سنّت الٰہی کی طرح اس سنّت میں بھی حکمت پوشیدہ ہے ایک حکمت امت کا امتحان ہے۔ غیبت کے زمانہ میں دین خدا کا اتباع کرنے والوں اور آسمانی رہبر کو چاہئے کہ وہ ہوشیاری سے اپنے ایمان کو محفوظ رکھیں اور اسے شرک و خرافات کی آلائش سے دور رکھیں۔

اس سلسلہ میں امام حسن عسکریؑ کا ارشاد ہے:

"میرے بعد میرا بیٹا قائم ہے پیغمبروں کی طرح اس کی عمر دراز ہوگی اور وہ لوگوں کی نظروں سے غائب ہو جائے گا۔ اس کی طویل غیبت میں دل سیاہ ہو جائیں گے۔ صرف ان لوگوں کے قلوب نور الٰہی سے روشن ہوں گے اور روح خدا کی مدد ان لوگوں کو پہنچے گی۔ جن کا میرے فرزند پر اعتقاد ہوگا۔" (بحار الانوار ج ۵۱/ ص ۲۲۴)

غیبت صغریٰ

حضرت مہدیؑ نے ۱۵ شعبان ۲۵۵ھ میں ولادت پائی اور اپنے نور سے کائنات کو منور کیا امام حسن عسکری کی وفات کے بعد پانچ سال کی عمر میں منصب امامت پر فائز ہوئے۔ لیکن عباسی خلیفہ معتمد کی تفتیش کی بنا پر لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو گئے اور اس مدت میں (۲۶۰ھ سے ۳۲۹ھ تک) اپنے مخصوص نائبوں کے ذریعہ لوگوں سے رابطہ رکھا۔ آپ کے شیعہ انہی کے ذریعہ اپنے مسائل و مشکلات کو حضرت تک پہنچاتے تھے اور اپنا فریضہ معلوم کرتے تھے اس زمانہ کو غیبت صغریٰ کہا جاتا ہے آپ کے نائبوں میں حسب ذیل افراد نے ترتیب وار اپنی ذمہ داری کو پورا کیا۔

۱۔ عثمان ابن سعید (۲۶۰ھ سے ۲۸۰ھ تک)

۲۔ محمد ابن عثمان (۲۶۰ھ سے ۳۰۵ھ تک)

۳۔ ابوالقاسم حسین ابن روح نوبختی (۳۰۵ھ سے ۳۲۶ھ تک)

۴۔ ابوالحسن علی ابن محمد سیمری (۳۲۶ھ سے ۳۲۹ھ تک)

آپ کے آخری نائب کی عمر صرف چھ روز باقی بچی تھی کہ آپ کی طرف سے درج ذیل مضمون کا توقیع نامہ پہنچا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"اے علی ابن محمد سیمری! خداوند تمہارے غم میں تمہارے بھائیوں کو اجر عظیم عطا فرمائے کیونکہ چھ روز کے بعد تم اس زندگی کو

خیرباد کہو گے ۔ لہٰذا اپنے کاموں کو سمیٹ لو اور اپنی جانشینی کے لئے کسی کی سفارش نہ کرنا کیونکہ غیبت کبریٰ کا زمانہ شروع ہو چکا ہے اور اب اسی وقت ظہور ہو گا جب خداوند عالم کا حکم ہو گا اور یہ اس وقت ہو گا جب لوگ قسی القلب ہو چکے ہوں گے اور زمین ظلم و جور سے بھر چکی ہو گی[1] .....

غیبت کبریٰ

مخصوص نائبوں کا زمانہ ختم ہوا اور غیبت کبریٰ کا آغاز ہوا تو شیعوں کے امور کی ذمہ داری جامع الشرائط مجتہدین پر عائد ہوئی ۔ اسحاق ابن یعقوب کے سوال کے جواب میں آپؑ نے تحریر فرمایا :

و امّا الحوادث الواقعة فارجعوا فيها الى رواة حديثنا فانّهم حجّتی عليكم و انا حجة الله عليهم[2]

"رونما ہونے والے حوادث میں ہماری احادیث بیان کرنے والوں کی طرف رجوع کرنا کیونکہ وہ تم پر میری حجت ہیں اور میں ان پر خدا کی حجت ہوں۔"

---

[1] غیبت شیخ طوسی ص ۲۴۲ — ۲۴۳

[2] کشف الغمہ جلد ۳

البتہ حدیث بیان کرنے والوں سے سادہ لوح راوی مراد نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو حدیث کو پہچانتے ہیں اور امام سے اس کی نسبت کو مشخص کرتے ہیں۔ انہی کو فقیہ و مجتہد کہتے ہیں۔

عہد طفولیت میں امامت

ممکن ہے یہ سوال سامنے آئے کہ پانچ سالہ بچہ کیسے منصب امامت پر فائز ہو سکتا ہے اور کیوں کر ایک امت کی قیادت سنبھال سکتا ہے؟ جو شخص خدا کے قادر مطلق ہونے پر اعتقاد رکھتا ہے اس کے لئے ان باتوں کا قبول کرنا آسان ہے کیونکہ وہ خدا کے عظیم پیغمبروں کے بارے میں ان باتوں کو تسلیم کرتا ہے۔

قرآن کریم حضرت یحییٰ ابن ذکریا کے بارے میں فرماتا ہے:

یا یحییٰ خذ الکتاب بقوۃ و آتیناہ الحکم الصبیاً[1]

"اے یحییٰ کتاب خدا کو مضبوطی سے تھام لو اور ہم نے بچپن میں ان کو پیغمبری سے نوازا ہے۔"

اسی طرح حضرت عیسیٰ کے متعلق فرماتا ہے:

قالوا کیف نکلم من کان فی المھد صبیا قال انی عبد اللہ اتانی الکتاب وجعلنی نبیا۔[2]

---

[1] مریم / ۱۲

[2] مریم / ۲۹-۳۰

"انہوں نے کہا بھلا گہوارہ میں آرام کرنے والے بچے سے ہم کیسے گفتگو کریں (اس وقت جناب عیسیٰ نے فرمایا) میں خدا کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور مجھے پیغمبر بنایا ہے۔"

ائمہ علیہم السلام میں بھی بعض ایسے ہیں جو عہد طفولیت میں منصب امامت پر فائز ہوئے جیسے امام محمد تقیؑ نو سال کی عمر میں اور حضرت امام علی نقیؑ آٹھ سال کی عمر میں منصب امامت پر فائز ہوئے اس بنا پر غیبت کبریٰ کا مسئلہ حضرت حجت سے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق خدا کے ارادہ سے ہے۔

طول عمر کا مسئلہ

بارھویں امامؑ کو خدا کے ارادہ سے ایک طویل عمر عطا ہوئی ہے اور غیبت کے روز سے آپؑ نے کسی کو دیدار نہ کرایا اور آپ کی آسمانی نورانیت پردہ غیبت میں چھپ گئی اور اب اسی وقت ظہور کریں گے اور دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے جب خدا کا حکم ہوگا اور اس وقت تک زندہ رہیں گے۔ البتہ یہ موضوع امام قائمؑ ہی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ بہت سے پیغمبر ایسے گذرے ہیں کہ جنہوں نے سیکڑوں سال کی عمر پائی ہے قرآن کے لحاظ سے حضرت نوح طوفان سے پہلے لوگوں کے درمیان نو سو پچاس سال تک دین خدا کی تبلیغ کرتے رہے۔ ؂

(؂ عنکبوت/۱۴)

عمرانیات کے نقطہ نظر سے انسان کی حیات کا کوئی اندازہ نہیں ہے اور اسی یا سو سال انسان کے موت کا باعث نہیں ہیں بلکہ اس کی موت کی اصل علت یہ ہے کہ انسان کے بعض اعضاء کو عوارض متاثر کرتے ہیں اور انہیں کام کرنے سے روک دیتے ہیں، بدن انسانی میں اعضاء کے درمیان جو ارتباط موجود ہے اس کی بنا پر ایک عضو تمام اعضاء اور بدن کی دوسری مشنریوں میں سرایت کرتا ہے اور ان کے فرسودہ ہو جانے سے آدمی کی حیات ختم ہو جاتی ہے دانشوروں نے طویل العمر درختوں اور ان کے ہزاروں سال تک باقی رہنے کی تحقیق کی ہے۔ تاکہ انسان طول عمر کا سراغ لگا سکیں اس بنا پر کہ تجربی علوم نہ فقط طول عمر کو محال نہیں جانتے بلکہ اس کے امکان کی تحقیق کر دی ہے، اس کے علاوہ حضرت مہدیؑ کا عرصہ دراز سے زندہ رہنا خدا کے ارادہ کے تحت ہے جس چیز کو بھی انسان اپنی طاقت کے لحاظ سے ناممکن سمجھتا ہے وہ قدرت خدا کے لئے ممکن و انجام پذیر ہے۔

وہی ارادہ جس نے شعلہ ور آگ کو حضرت ابراہیمؑ کے لئے سرد و بے ضرر کر دیا تھا، جس نے عصائے موسیٰ کو خطرناک اژدھا بنا دیا تھا، جس نے تین سو سے زیادہ سال تک اصحاب کہف کی سونے کی حالت میں حفاظت کی، جس نے طوفان سے قبل نوحؑ کو ۹۵۰ سال کی مدت تک پیغمبری پر مامور کیا، اسی لامحدود و مطلق ارادہ نے حضرت مہدیؑ کو اتنی طویل عمر عطا کی ہے اور امر خدا میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی ہے۔

خلاصہ

(۱) غیبت سنت الٰہی ہے جس میں رموز و حکمت پوشیدہ ہیں ان ہی میں سے ایک امتحانی پہلو ہے اور یہ سنّت پیغمبروں میں بھی جاری تھی۔

(۲) حضرت مہدیؑ کی دو غیبتیں ہیں: غیبت صغریٰ کہ جس میں آپؑ کے مخصوص نائب لوگوں کے مشکلات کو حل کرتے تھے اور غیبت کبریٰ میں ان کی ذمہ داری فقہا کے اوپر عائد ہوئی ہے

(۳) مشیت الٰہی کے تحت حضرت مہدی کو طویل عمر عطا ہوئی ہے اور یہ مسئلہ پیغمبروں سے متعلق رہا ہے اور عمرانیات کے ماہرین نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔

سوالات

(۱) غیبت کا امتحانی پہلو لکھئے۔

(۲) غیبت صغریٰ اور امام مہدیؑ کے خاص نائبوں کے نام لکھئے۔

(۳) غیبت کبریٰ کیا ہے اور اس زمانہ میں لوگوں کے کیا فرائض ہیں؟

(۴) آپؑ کی طولانی عمر کی کیا نوعیت ہے؟

(۵) کیا بچہ بھی لوگوں کا قائد و امام بن سکتا ہے؟

بارھواں سبق

اسلامی حکومت اور ولایتِ فقیہ

- اسلام کا اجتماعی نظام
- غیبت کے زمانے میں حکومت کی تشکیل
- نیابت کے بارے میں چند دلیلیں
- خلاصہ
- سوالات

اسلامی حکومت اور ولایت فقیہ

اسلام کا اجتماعی نظام

آسمانی مذاہب اور الٰہی آئین جو کہ بشر کی سعادت و راہنمائی اور ہدایت کے لئے آئے ہیں، انہوں نے انسان کی کامل سعادت کے لئے وسیع اور کامل پروگرام پیش کئے ہیں اور مذاہب کے دستورات انفرادی عبادت اور روزہ و نماز اور اخلاقی مسائل میں محدود نہیں ہیں بلکہ ان مذاہب نے انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھا ہے اور ان کے لئے "دستور العمل" معین کئے ہیں۔
مکتب الٰہی اور آسمانی دین، اسلام، جو کہ آسمانی آئین میں جامع ترین دین ہے۔ اس نے مکمل طور پر انسان کی انفرادی، اجتماعی، دنیوی اور اخروی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر توجہ کی ہے اور ان تمام پہلوؤں کے بیان کرنے سے گریز نہیں کیا ہے جو کہ آدمی کی سعادت کا موجب ہیں، پیغمبر اسلام لوگوں کے سامنے خدا کے احکام اور دستورات کو بیان کرتے تھے اور احکام اسلامی کو اسلامی حکومت کے سایہ میں عملی جامہ پہناتے تھے احکام خدا کو بیان بھی کرتے تھے اور اسلامی حکومت بھی تشکیل دیتے تھے ۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی خوش بختی اسی میں ہے کہ اسلامی حکومت تشکیل پائے اور اس کے سایہ میں اسلامی قوانین نافذ ہوں اور حکومت کی تشکیل کے بغیر اسلامی احکام کا نفاذ ناممکن ہے،

اس سلسلہ میں بہت سی روایات موجود ہیں، جن سے یہ بات واضح ہے کہ معاشرہ کی سرفرازی اور کامیابی اسی میں ہے کہ الٰہی قوانین کے مطابق ایک حکومت قائم ہو۔

جیسا کہ ایک روایت میں مروی ہے:

لا یصلح النّاس الّا بامام ولا تصلح الارض الّا بذٰلک[1]

"امام کے بغیر لوگوں کی اصلاح نہیں ہو سکتی اور زمین کی اصلاح بھی اسی پر موقوف ہے۔"

صرف اقتصادی طاقت ہی معاشرہ میں احکام خدا کو نافذ کر سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں امام رضا علیہ السلام کی ایک مفصل حدیث موجود ہے:

انّ الامامة۔ الامام۔ اسّ الاسلام النّامی وفرعه السّامی، بالامام تمام الصّلاة والزکاة والصّیام والحج والجهاد وتوفیر الفیی والصّدقات وامضاء الحدود والاحکام ومنع الثغور والاطراف۔[2]

---

[1] علل الشرائع باب ۵۳/ص ۱۸۶

[2] علل الشرائع باب ۵۲/ص ۱۸۶

"امامت رشد کرنے والے اسلام کی جڑ اور اس کی بار آور شاخ ہے اور امام کے ذریعہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد، بیت المال اور صدقات کی وصول یابی، حدود و احکام کا نفاذ اور کامل طور پر سرحدوں کا دفاع ہوتا ہے۔"

واضح ہے کہ بغیر حکومت کی تشکیل کے تمام اسلامی احکام کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔ احکام کا بیان کرنا ایک فریضہ ہے اور ان کا نفاذ دوسرا فریضہ ہے۔

غیبت کے زمانہ میں حکومت کی تشکیل

پیغمبر اکرمؐ، اسلام کے احکام کو بیان فرماتے تھے اور اس کے منصوبوں کو اسلامی حکومت کے سایہ میں عملی جامہ پہناتے تھے۔ آپؐ کی وفات کے بعد ائمہ معصومینؑ کا فریضہ ہے کہ وہ احکام بیان کریں اور نافذ کریں لوگوں کو چاہئے کہ ان ہی سے اسلام کے احکام حاصل کریں اور ان کی امامت کو قبول کریں تاکہ حکومت کی تشکیل اور اسلام کے احکام کے نفاذ کے لئے زمین ہموار ہو جائے۔ ماضی میں ہم امام کی رہبری سے آشنا ہو چکے ہیں اور اس کے مختلف پہلوؤں سے بھی آگاہ ہو چکے ہیں ان ہی میں سے ایک، امام کی معنوی اور باطنی ہدایت ہے جو کہ زمانۂ غیبت میں بھی اسی طرح جاری ہے اور اس زمانہ میں روایات کی تعبیر کے مطابق امام کی مثال بادل میں چھپے ہوئے سورج کی سی ہے۔ اس کا نور ہدایت لوگوں کے راستے کو روشن کرتا ہے۔ امام کے فرائض میں سے "مذہب کی مرجعیت اور احکام بیان کرنا ہے" اور "روئے زمین پر

سیاسی قیادت اور حکومت کی تشکیل ہے۔ ان امور میں لوگوں کا کیا فرض ہے؟ کیا کلی طور پر اسلام کے احکام کو مسترد کر دیا جائے اور مسلمان دوسروں کی فرمان روائی کے زیرِ سایہ آجائیں؟ یا زمانۂ غیبت میں مذہبی مرجعیت کو سیاسی قیادت سے جدا کر دینا چاہیے۔ ایک کو فقہاء کے اور دوسرے کو سیاست دانوں کے اوپر چھوڑ دیا جائے؟

دین کو سیاست سے جدا کرنے والا نعرہ اسی مطلب کو باور کرانے کیلئے ایجاد کیا گیا ہے۔ اگر اسلام کے احکام کے متعلق ایسی تفکیک روا ہوتی اور فقیہ کی نیابت کا دائرہ صرف احکام بیان کرنے تک محدود ہوتا تو امام کو آنے والے دستور العمل میں یہ بیان فرمانا چاہیے تھا: فقیہ کو اسلام کے احکام بیان کرنے چاہیے اور سیاسی لوگوں کو حکومت کی باگ ڈور سنبھال کر احکام نافذ کرنا چاہیے۔

امامت کے متعلق وارد ہونے والی روایتوں سے بالعموم اور نیابت کی دلیلوں سے بالخصوص یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حکومت کی تشکیل کے بغیر اسلام کے احکام کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔ اگر ہم یہ چاہیں کہ تمام احکامِ الٰہی اور آسمانی تعلیمات اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ نافذ ہوں تو ہم حکومت کی تشکیل کے محتاج ہیں کیونکہ اس کے علاوہ احکام اسلام کے ایک بڑے حصہ پر عمل کے سلسلہ میں تعطل قبول کرنا پڑتا ہے۔

نیابت کے بارے میں چند دلیلیں

۱۔ امیر المومنین علیہ السلام نے پیغمبر اکرمؐ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے

فرمایا:

اللّٰھم ارحم خلفائی قیل یا رسول اللّٰہ ومن خلفائک؟ قال الذین یاتون بعدی یروون حدیثی وسنّتی۔[1]

"بار الٰہا میرے جانشینوں پر رحم فرما پوچھا گیا یا رسول اللہ آپ کے جانشین کون ہیں؟ فرمایا: جو میرے بعد آئیں گے اور میری حدیث وسنت کو بیان کریں گے۔"

۲۔ عمر ابن حنظلہ کی مقبولہ روایت کے ایک حصہ میں منقول ہے:

من کان منکم قد روی حدیثنا ونظر فی حلالنا وحرامنا وعرف احکامنا فلیرضوا بہ حکماً فانی قد جعلتہ علیکم حاکماً فاذا حکم بحکمنا فلم یقبلہ منہ فانما استخف بحکم اللّٰہ وعلینا رد والراد علینا الراد علی اللّٰہ وھو علی حد الشرک باللّٰہ۔[2]

تم میں سے جو بھی ہماری حدیث بیان کرے اور ہمارے حلال وحرام کو مدنظر رکھے، ہمارے احکام کو پہنچاتے اس کے سامنے

---

[1] معانی الاخبار ص۳۷۴

[2] وسائل الشیعہ ج ۱۸/ص ۹۹

تم سر تسلیم خم کردو - کیونکہ میں نے اس کو تم پر حاکم مقرر کیا ہے - پس اگر اس نے ہمارے فرمان کے مطابق حکم دیا اور لوگوں نے اس کو قبول نہ کیا تو گویا انہوں نے حکم خدا کو حقیر سمجھا اور ہمارے حکم کو رد کر دیا اور جو ہمارا حکم رد کرتا ہے وہ درحقیقت ہمارے خدا کا حکم رد کرتا ہے اور یہ خداوند عالم کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے برابر ہے۔"

۳- امام حسین علیہ السلام سے نقل شدہ حدیث کے ایک حصہ میں منقول ہے :

وذالك بان مجاری الامور والاحکام علیٰ ایدی العلماء باللہ الامناء علیٰ حلالہ وحرامہ[1]

"اور یہ اس لئے ہے کہ امور کا نفاذ اور احکام کا بیان کرنا ان علماء کی ذمہ داری ہے جو خدا کے حلال و حرام کے امین ہیں۔"

یہ اقتباسات ان احادیث سے بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں جو کہ زمانۂ غیبت میں لوگوں کے فرائض کو بیان کرتی ہیں ان روایات میں ان علماء کی خصوصیات بھی مذکور ہیں کہ جن کی طرف رجوع کرنا چاہئے - ان کے عناوین قانون اساسی میں بیان ہوئے ہیں۔

---

[1] تحف العقول ص۲۴۲

خلاصہ

(۱) آسمانی مذاہب، جو انسان کی سعادت کے لیے آئے ہیں، انہوں نے انسان کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے وسیع پروگرام معین کئے ہیں۔

(۲) اسلام کے حیات بخش قوانین حکومت کی تشکیل قدرت اور طاقت کے استعمال سے مربوط ہیں اسی لئے انبیاء اور ائمہ ان کو بیان کرتے تھے اور معاشرہ کی رضامندی کی صورت میں حکومت تشکیل دیتے تھے۔

(۳) امامت کے سلسلہ میں وارد ہونے والی دلیلیں عموماً اور نیابت سے متعلق دلیلیں خصوصاً یہ بات ثابت کرتی ہیں کہ حکومت کی تشکیل کے بغیر احکام الٰہی کا نفاذ مشکل ہے کیونکہ حکومت کے بغیر احکام خدا وندی میں عظیم تعطل رونما ہوگا۔

سوالات:

(۱) آسمانی مذاہب کی جامعیت کی وضاحت کیجئے؟

(۲) آسمانی رہبروں کے ذریعہ تشکیل پانے والی حکومت کیلئے کس چیز کی ضرورت ہے؟

(۳) غیبت کے زمانہ میں امام کا فریضہ تحریر کیجئے؟

(۴) کیا احکام کے بیان کرنے والی ذمہ داری کو انکے نفاذ سے جدا کیا جاسکتا ہے؟

(۵) نیابت کی دلیلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے فقیہ کے اختیارات کی وضاحت کیجئے۔
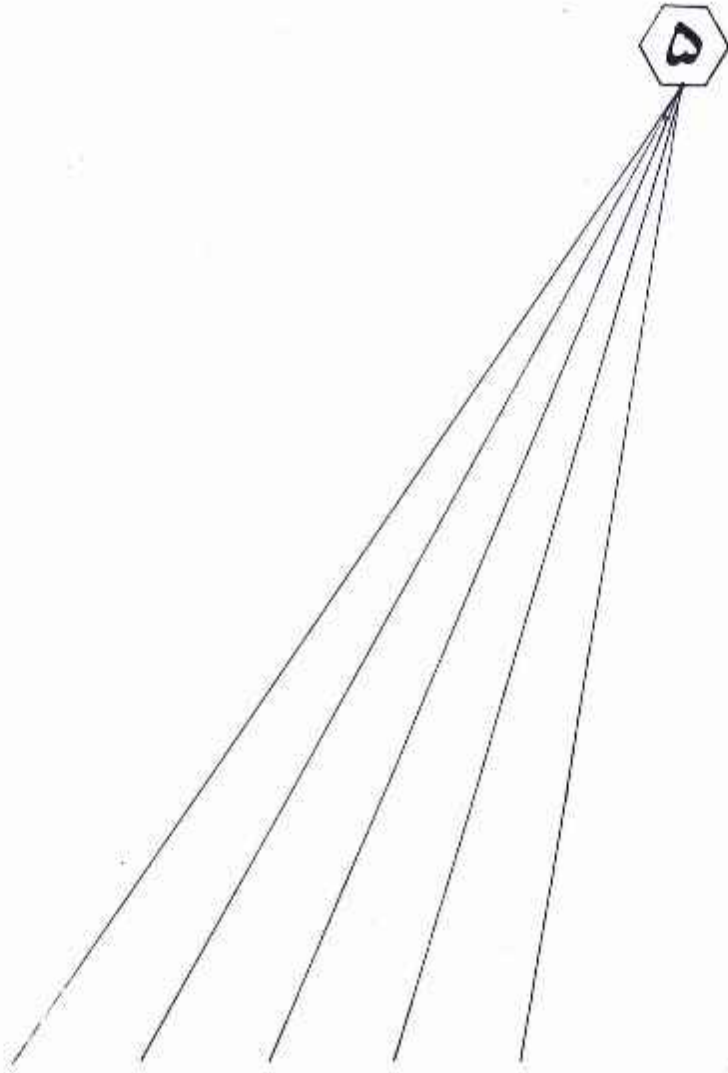
۵
معاد کی بحث

معاد کا عقیدہ، ایک تعمیری پہلو

- معاد کی اہمیت
- بحث کا طریقہ
- معاد کا عقیدہ، ایک تعمیری پہلو:
  ۱- اضطراب میں آرام
  ۲- مسؤلیت آفرینی
  ۳- اجتماعی عدالت کا پشتوانہ
- خلاصہ
- سوالات

معاد کی اہمیت

"معاد" عود سے مشتق ہے اور اس کے معنی باز گشت کے ہیں[1] چنانچہ روز قیامت بدن میں دوبارہ روح کی باز گشت کو معاد کہا جاتا ہے۔

معاد اور واپسی کی زندگی پر ایمان رکھنا ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جو کہ تمام آسمانی مذاہب میں مشترک ہے اور یہ مسئلہ ان مذاہب کا بنیادی اصول شمار کیا جاتا ہے خدا کے تمام پیغمبروں نے خدا اور توحید کی معرفت کے بعد موت کے بعد شروع ہونے والی دنیا کی تعلیم دی ہے اور بشر کو اس واپسی کی زندگی کی طرف متوجہ کیا ہے۔

دین اسلام جو کہ آسمانی مذاہب میں کامل ترین دین ہے اس نے معاد کو تصور کائنات کے اصول میں شمار کیا ہے اور معاد پر ایمان لانے کو مسلمان ہونے کی شرط قرار دیا ہے اور اسے ارکان اسلام بتایا ہے یعنی اگر کوئی باز گشت پر ایمان نہ رکھے اور معاد کا انکار کر دے تو دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا اور مسلمانوں کے زمرہ سے نکل جائے گا۔

مسلمانوں کی آسمانی کتاب قرآن نے معاد کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ آیات قرآنی کا تقریباً ⅓ حصہ ایک لحاظ سے معاد کے متعلق ہے

---

[1] المنجد ص ۵۳۶

اور قیامت میں انسانوں کے زندہ ہونے کی کیفیت، میزان، حساب، تجسم اعمال اور بہشت و دوزخ ایسے مسائل سے بحث کی ہے اور بارہ آیتوں میں واضح طور پر خدا پر ایمان لانے کے بعد آخرت پر ایمان کا ذکر ہے۔

اسی طرح قرآن مجید کے بہت سے سورے قیامت اور اس کے موضوعات ومسائل کے بارے میں نازل ہوئے ہیں۔ مثلاً سورۂ قارعہ، قیامت، واقعہ، زلزال، انفطار اور نباء وغیرہ۔

بحث کا طریقہ

معاد سے مربوط بحث دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے ان دونوں میں سے ہر ایک سے بحث کا طریقہ مسائل و موضوعات کی نوعیت کے اعتبار سے جدا ہے۔

۱۔ خود معاد سے بحث

۲۔ اس کی کیفیت سے بحث

معاد کو عقلی دلیل سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے اور فکر انسان اس میدان میں جولانی کر سکتی ہے۔ چنانچہ وحی اور قرآن نے بھی انسان کے اس ادراک اور فکر کی تصدیق کی ہے۔

لیکن دوسرے حصہ میں معاد کی کیفیت سے بحث ہوتی ہے اس سلسلہ میں انسانی فکر کفایت کناں نہیں ہے انسان اس کی مدد سے معاد کے جزئی مسائل کا ادراک نہیں کر سکتا۔ اس سلسلہ میں معرفت و آگہی کا سرچشمہ صرف

وحی الٰہی اور رموزِ وحی و غیبت کے اسرار سے واقف افراد کے اقوال ہیں۔

اس بنا پر انسانی عقل و فکر کا اس طرف گذر نہیں ہے اور انسان انکی مدد سے معاد کے مسائل و موضوعات کی تحقیق نہیں کر سکتا۔ اس سلسلہ میں بوعلی سینا کہتے ہیں:

"..... یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ شرع نے معاد کو قبول کیا ہے اور احادیث نبوی اور شریعت کے علاوہ اس کے اثبات کا کوئی طریقہ نہیں ہے اور یہ معاد جسمانی ہے کہ جس میں بدن اٹھائے جائیں گے لیکن معاد کا کچھ حصہ عقل اور قیاس برہانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جبکہ نبی نے اس عقلی ادراک کی تصدیق کی ہو وہ حصہ نفسیات کی سعادت و شقاوت ہے جو کہ عقلی قیاس کے ذریعہ ثابت ہو چکی ہیں۔ اگرچہ ہماری معلومات اس کی کیفیت کا ادراک کرنے سے عاجز ہیں [۱]"

معاد کا عقیدہ ایک تعمیری پہلو

معاد پر اعتقاد رکھنے سے آدمی کی فکری کارگاہ میں بہت بڑا انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ نفسیات اور اس کی فکر کی شعاعیں اسے طبعی حکومت اور مادی زنجیروں سے رہائی دلاتی ہیں یہ انقلاب و تبدیلی اسی سچے اعتقاد کا نتیجہ ہے

---

[۱] منقول از زاد المسافر ملا صدری/ ۴۴

یہ انسانوں کے معنوی رشد وارتقاء اور ان کی فردی واجتماعی زندگی پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔

یہ اعتقاد انسانوں کی کوشش وجانفشانی کو معنوی سمت کی طرف موڑتا ہے اور ان کے عمل کی بساط کو ابدیت تک پھیلا دیتا ہے۔ اس سے معاشرہ کے کالبد میں معنوی روح پیدا کرتا ہے اور انھیں ایک عظیم مقصد کے حصول کیلئے ابھارتا ہے۔ اس عقیدہ کے تعمیری نتائج پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

۱۔ اضطراب میں آرام

اخروی زندگی پر اعتقاد، آدمی کی عقل کی پرواز کو عالم مادی سے نجات دلاتا ہے اور اس کے طائر فکر کو مادی زندگی کی تنگنائے سے آزاد کرتا ہے۔ مادی مکاتب کے ماننے والے، اس خیال سے کہ انسان صرف مادی پیکر ہے، اسے بے جان مادہ کی زنجیروں میں جکڑ دیتے ہیں اور اس کی طاقت وقدرت اور کوششوں کو طبیعت میں محدود کر دیتے ہیں۔ وہ آدمی کی معتدبہ سعادت کو مادی زندگی میں بیان کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ انسان تگ و دو اور اس کی زندگی کے انجام کو اسی مادہ کی تاریک دنیا میں محدود جانتے ہیں۔ اس نظریہ کا قطعی نتیجہ ایک خیال خام ہے جس نے انسان کی زندگی سے ہر قسم کے مفہوم کو سلب کر لیا ہے اور اس کی فکر کے سرا پردوں سے ہر ایک امید کو محو کر دیتا ہے۔ ایسا نظریہ اور احساس انسان پر امید کی آخری کرن کے جھروکے کو بھی بند کر دیتا ہے اور اس کے جان افزا نغموں کو اس تاریک مستقبل کی فضا میں

خاموش کردیتا ہے جس کی وہ خود تبلیغ کرتا ہے۔

آج دانشوروں کو اس بات کا اعتراف ہے کہ ترقی یافتہ ممالک اور صنعتی ملکوں میں نفسیاتی امراض کا سرچشمہ اور خودکشی کی شرح میں اضافہ ، مادی رجحان عیش پرستی ۔ بے ایمانی اور معاشروں میں مذہب کی بے اہمیتی ہے۔

جن لوگوں کا یہ نظریہ ہے کہ ٹیکنالوجی کا ارتقاء ، بشری علم و دانش اور تجربی علوم کی پیش رفت انسان کی مذہبی ضرورت کو برطرف کرتی ہے اور وہ سب کچھ علم و دانش کو سمجھتے ہیں ، عنقریب آپ کو یہ معلوم ہوجائے گا کہ آج کا انسان ماضی سے زیادہ مذہبی معنویت اور ایمان کا محتاج ہے اور وہ بشر کی جس سعادت کو علم کے پرتو میں خیال کرتے ہیں وہ سراب ہے جو انسان کی روح و نفس کو سیراب نہیں کرسکتا۔

اس بنا پر ، صرف مذہبی عقیدہ و ایمان ہی انسان کے قلب و جان سے رکیک فکر و خیال کو باہر نکالتا ہے اور یہ خام خیالی اجتماعی دنیا سے محو ہوجاتی ہے ، اور اس کے پرتو میں انسان کی زندگی کو نئی زندگی و ارتقاء نصیب ہوتا ہے۔

۲۔ مسئولیت آفرینی

ذمہ داری ، عہد ، ایثار اور فداکاری و شہادت بہت ہی خوبصورت الفاظ ہیں ، جو قوموں کی جہادی زندگی میں ورد زبان ہوجاتے ہیں چنانچہ سارے مکاتب اپنے ماننے والوں کو ان چیزوں کی دعوت دیتے ہیں۔

لیکن معمولی غور و فکر کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ صرف معاد

پر ایمان کے پرتو میں ان کلمات کے حقیقی معنیٰ و مفہوم حاصل کئے ہیں صرف یہی عقیدہ ذمہ داری کے احساس کے شعلہ کو قلب انسان میں بھڑکاتا ہے اور فریضہ کو صفحات سے اٹھا کر دلوں میں بٹھاتا ہے۔

مادی اور بشری مکاتب جب عہد و ذمہ داری کو اپنے ماننے والوں کے دل میں بٹھانا چاہتے ہیں۔ تو ان کے خیال میں اس کے ذمہ دار، لوگ، معاشرہ، محروم اور تاریخ وغیرہ ہوتے ہیں لیکن اس بات کے پیش نظر کہ ان الفاظ کا تعلق لوگوں کے جذبات و احساسات سے ہے۔ اس لئے یہ عقل کو مطمئن نہیں کر سکتے وہ حقیقی مسئولیت کے احساس کو باطن میں جگہ نہیں دے سکتے ہیں۔

لیکن آسمانی مکتب اور خدا و روز آخرت پر ایمان و اعتقاد کے سایہ میں یہ تمام عہد و ذمہ داریاں خالق کائنات کے سامنے اپنے کو ذمہ دار سمجھنے کے پرتو ہی میں انجام دی جا سکتی ہیں۔ حقیقت میں انسان صرف خدا کے بالمقابل ذمہ دار ہے اور اپنے تمام اعمال و کردار کے سلسلہ میں خدا کی بارگاہ میں جواب دہ ہے یہی وہ حقیقی مسئولیت ہے جو انسان کی فردی و اجتماعی مسئولیتوں کی پشت پناہی کر سکتی ہے۔

۳۔ اجتماعی عدالت کا پشتوانہ

خدا کی بارگاہ میں جواب دہی کا احساس، اخروی جزا پر ایمان اور خدا کی عدالت میں انسان کے تمام اعمال و کردار کا حساب انسانوں کو محتاط بناتا ہے۔

اور انسان کے خود اپنے اعمال و کردار کا نگہبان بننے کا باعث ہوتا ہے، اس لحاظ سے کہ اس کا عقیدہ ہے کہ وہ اپنے اعمال کا جواب دہ ہوگا۔ قیامت کی عدالت میں اسے جواب دینا ہے، وہ جانتا ہے کہ اسے حساب دینا ہے اور اس کے ہر چھوٹے بڑے عمل کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً
یرہ۔ ومن یعمل مثقال ذرۃ
شراً یرہ[1]

"جو ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا اور جو
ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا۔"

یہاں تک کہ اس کے ارادوں سے اور اس کے دل کے خطور سے بھی خدا واقف ہے:

لقد خلقنا الانسان ونعلم ما
توسوس بہ نفسہ ونحن
اقرب الیہ من حبل الورید[2]

ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ
اس کا نفس کیا کیا وسوسے پیدا کرتا ہے اور ہم اس سے

---

[1] زلزال/ ۷ و ۸

[2] ق/ ۱۶

رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں۔"

اس بنا پر جو شخص آخرت اور روز جزا پر ایمان رکھتا ہے اور خود کو بارگاہ خدا میں جواب دہ سمجھتا ہے وہ ہمیشہ محتاط رہتا ہے کہ کہیں خدا کے حریم قانون سے تجاوز نہ کر جائے اور حق و عدالت کے راستہ سے منحرف نہ ہو جائے، اس کے لئے ظاہر و باطن یکساں ہے اور لوگوں کے حقوق کو محترم سمجھتا ہے۔ ہر لحظہ اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ حق و حقیقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور ہمیشہ حق کے محور پر باقی رہے۔

خلاصہ

(۱) معاد یعنی قیامت کے روز دوبارہ روح بدن میں لوٹ آئے گی۔ معاد آسمانی مذاہب کا بنیادی اصول ہے اور اسلام نے اسے بہت اہمیت دی ہے اور قرآن نے اس کے موضوعات کو وسیع پیمانہ پر بیان کیا ہے۔

(۲) اخروی زندگی پر ایمان و اعتقاد رکھنا انسانی عقل و فکر کو مادی دنیا سے آزادی دلاتا ہے اور انسان کی زندگی کو عبث و فضول باتوں سے پاک کرتا ہے

(۳) معاد پر اعتقاد کے پرتو میں ذمہ داری اور جواب دہی کتاب کے صفحات سے اٹھ کر قلب پر نقش ہو جاتے ہیں۔

(۴) اخروی جزا پر ایمان، اجتماعی و معنوی عدالت کا پشتوانہ ہے، ایسے عقیدہ کے پرتو میں انسان خدا کو اپنے اعمال کا نگراں تصور کرتا ہے اور خدا کے فرشتوں کو اپنے اعمال کا حساب لینے والا سمجھتا ہے اور وہ روز قیامت اپنے تمام اعمال کا جوابدہ ہوگا۔

سوالات

(۱) مادی نظریات انسانی زندگی کو کس طرح پیش کرتے ہیں اور ان کے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں؟

(۲) انسان کا قلبی آرام اخروی زندگی کے پرتو میں ہے، وضاحت کیجئے

(۳) ذمہ داری اور جواب دہی کے احساس کی انسان کے اندر کس وقت تقویت ہوتی ہے؟

(۴) اجتماعی عدالت کے اجراء میں، اخروی جزا پر ایمان کا کیا اثر ہے؟

(۵) معاد کے مسائل و موضوعات کو پیش کرنے کے طریقہ سے بحث کیجئے۔

گزشتہ ادیان میں قیامت کا مفہوم

- معاد کا وسیع عقیدہ
- معاد، اوستا کی نظر میں
- معاد یہودی مذہب کی نظر میں
- معاد، چاروں انجیلوں میں
- خلاصہ
- سوالات

معاد کا وسیع عقیدہ

حیات بعد از موت کے عقیدہ اور نظریہ کی اہمیت کی علامتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کا مفہوم طول تاریخ میں تمام لوگوں کے درمیان رہا ہے۔ آسمانی مذاہب سے قطع نظر کہ ان میں معاد پر اعتقاد رکھنے کو اعتقادی اور فکری نظام کا اساسی پایہ شمار کیا گیا ہے، حیات بعد از مرگ اعتقاد و ایمان انسانی فکر کے مرکز میں موجود رہا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہمیشہ اور تمام لوگوں میں اس کا تصور رہا ہے۔

آثار قدیمہ کے ماہرین کی تحقیق و جستجو اور تلاش و کوشش گواہ ہے کہ ہماری تاریخ سے قبل بھی پرانی تہذیبوں میں مرنے کے بعد انسانوں کے دوبارہ زندہ ہونے کا عقیدہ تھا، ابتدائی زمانے کے انسان بھی آج کے انسانوں کی طرح دوبارہ زندہ ہونے کے معتقد تھے، ان کے نقطۂ نظر سے مرنے والے نہ صرف یہ کہ زندہ و باقی ہیں بلکہ ان کے وہی جذبات وضروریات ہیں جو پہلی زندگی میں تھے۔

قدیم مصریوں کا عقیدہ تھا کہ انسان کی روح کا بدن سے خارج ہونے کے بعد بھی بدن سے تعلق رہتا ہے اور مرنے کے بعد دوبارہ شوق سے اس بدن کی طرف پلٹ آئے گی جبکہ اس کی وہی پہلی خواہشیں، جیسے کھانا، پانی، ہوں گی، روح کا آرام اس میں ہے کہ بدن صحیح وسالم رہے اس لئے کھانا پانی اس کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں اور روح کے آنے جانے کے لئے قبر میں

ایک سوراخ بنا دیتے تھے تاکہ روح آسانی سے اس سے نکل سکے۔

اس عقیدہ کی وسعت، انسانوں کے افکار میں، واضح طور پر بتاتی ہے کہ یہ عقیدہ انسان کے وجود کی گہرائیوں میں اترا ہوا ہے اور اس کی فطرت میں رچا بسا ہوا ہے اور اس کا وجود اس سے خمیر ہے۔

معاد، اوستا کی نظر میں

زرتشت کے آئین میں بھی انسانوں کی دوبارہ زندگی اور مسئلہ قیامت سے بحث ہوئی ہے، اس بنا پر ان کا نظریہ ہے کہ جب دنیا کی عمر ختم ہو جائیگی تو اسی وقت قیامت آجائے گی۔

مرنے والے کا حساب و کتاب تھوڑی دیر بعد شروع ہو جاتا ہے اور اس کے بعد اس کی روح کی سرنوشت معین ہوتی ہے یہاں تک کہ قیامت برپا ہو گی اور اسے جزا یا سزا ملے گی۔ قیامت کے روز ہر روح کو ایک پل سے گزرنے کا پڑے گا، یہ پل دوزخ پر قائم ہو گا اور اس کی ایک طرف جنت کا دروازہ کھلتا ہے۔

پھر بدکار انسان کے اعمال ایک بوڑھی اور بدشکل عورت کی صورت میں مجسم ہوتے ہیں اور اس کی روح کو دوزخ کی طرف کھینچتے ہیں۔ بدکار نفس کو ایک باریک "تیز دھار پل سے گذارا جاتا ہے اور وہ پگھلی ہوئی دھات کی نہر میں گر پڑتا ہے اور دوزخ کے تین مراحل طے کر کے چوتھے طبقے میں پہنچتا ہے جو کہ تاریک ہے اور بدکاروں کا ٹھکانہ ہے - اس کے لئے زہر آلود اور بدبودار کھانا

لایا جاتا ہے اور مختلف قسم کے عذاب دیئے جاتے ہیں۔

اگر آدمی کے نیک و بد اعمال، یکساں و برابر ہوں گے تو اسے "ہمارہ یکیسان" نامی جگہ لے جایا جائے گا نہ وہاں جنّت کی نعمتیں اور لذتیں ہیں اور نہ دوزخ کا عذاب۔

اوِستا میں تینوں کرداروں "نیک منشی" "نیک گفتار" "نیک کردار" کیلئے جنّت میں مخصوص مقام معین کئے گئے ہیں۔

معاد یہودی مذہب کی نظر میں

موجودہ تورات (عہد عتیق) میں دنیا کے سلسلہ میں زیادہ بحث ہوئی ہے آخرت کے متعلق نہ ہونے کے برابر بحث ہوئی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ عہد عتیق میں حیات بعد از مرگ کا تذکرہ ہی نہ ہوا ہو۔ بلکہ تورات میں حیات بعد از مرگ سے متعلق عبارتیں اور صریحی جملے موجود ہیں۔

جامعۂ سلیمان نامی کتاب کے بارہویں باب میں بیان ہوا ہے:

"..... خدا سے ڈرو! اس کے حکم کو بجالاؤ، کیونکہ یہی انسان کی تکلیف ہے، اور خدا ہر ظاہر و مخفی عمل کا خواہ وہ نیک ہو یا بد، حساب لے گا۔"

"جس روز خدا غضبناک ہوگا اس روز ان کا سونا چاندی انھیں نجات نہ دلا سکے گا اس روز ساری زمین اس کے قہر سے جل جائے گی اور وہ زمین کے تمام بسنے والوں کا جلد از جلد

حساب لے گا۔"

"تمہارے مردے زندہ ہو جائیں گے اور (قبروں سے)
اٹھائے جائیں گے۔ تم خاک کے باشندے ہو بیدار ہو کر نغمہ
سرا ہو جاؤ کیونکہ تمہاری شبنم گھاس کی شبنم کے مثل ہے اور
زمین مردوں کو باہر نکال پھینکے گی۔"

عہد عتیق میں معاد کے سلسلہ میں جو واضح ترین جملہ وارد ہوا ہے وہ یہ ہے:
"خدا موت دیتا ہے اور زندہ کرتا ہے، بلند کو پست کرتا ہے اور پست کو بلند کرتا ہے، خدا فقیر بناتا ہے اور غنی کرتا ہے بلند کو پست اور پست کو بلند کرتا ہے!"

معاد چاروں انجیلوں میں

چاروں انجیلوں میں قیامت اور آخرت سے متعلق صاف وصریح طور پر اور گوناگوں تعبیروں میں بحث ہوئی ہے اور اس کے متعلق بہت سے مطالب بیان ہوئے ہیں۔

لیکن آخرت کی زندگی کے سلسلہ میں ان سب کا ایک نہج نہیں ہے انجیل "متی" میں سب سے زیادہ صاف وصریح طور پر اور مفصل بیان موجود ہے اور آخرت کے بارے میں بحث ہوئی اور اسے زیادہ اہمیت دی ہے۔

متعدد مقامات پر "قیامت کی طرف اشارہ ہوا ہے اور بعض جگہوں پر مختلف تعبیریں، جیسے حیات جاویداں، ملکوت، آسمان، خدا کا دیدار، قضاوت، روز جزاء، عذاب اور جہنم و بہشت، استعمال ہوئی ہیں۔ اب ہم آپ کے سامنے

ان کی اصل عبارت کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں:

انجیل متی کے باب ۲۲ میں ہے:

"کیا تم نے خدا کے اس کلام کا مطالعہ کیا ہے جو اس نے تم سے مردے اٹھانے کے متعلق کیا ہے؟ لے ابراھیم و و اسحاق اور مجھ یعقوب کے خدا تو مردوں کا خدا نہیں ہے بلکہ زندوں کا خدا ہے۔"

انجیل یوحنا باب ۱۱:

"عیسیٰ نے اس سے کہا: بھائی تم اٹھائے جاؤ گے۔ مرتا نے اس سے کہا: میں جانتا ہوں کہ تم قیامت کے روز اٹھائے جاؤ گے، عیسیٰ نے کہا: .... جو بھی مجھ پر ایمان لائے گا وہ اگر مردہ ہو گا تو زندہ ہو جائے گا اور اگر زندہ ہے اور مجھ پر ایمان لائے تو ابد تک نہیں مرے گا۔"

انجیل یوحنا فصل ۶:

"باپ کی خواہش کہ جس نے مجھے بھیجا ہے یہ ہے کہ جو میری راہ میں کچھ دے گا میں اس کا اجر ضائع نہیں کروں گا بلکہ قیامت کے روز اس کا عوض دونگا اور جس نے مجھے بھیجا ہے اس کی خواہش یہ ہے کہ جو شخص بیٹے کو دیکھے اور اس پر ایمان لائے وہ زندہ جاوید ہو جائیگا اور میں روز قیامت اسے اٹھاؤں گا۔"

انجیل مرقس باب ۳:

"بنی آدم کے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے، لیکن اگر روح القدس کو کفر کہا ہوگا تو ہرگز نہیں بخشا جائے گا۔ بلکہ ابدی عذاب میں مبتلا ہوگا۔"

خلاصہ

۱) آئین زرتشت میں قیامت اور انسانوں کی نئی زندگی بیان ہوئی ہے۔ مردوں کی روح کا تھوڑی دیر بعد حساب ہوتا ہے اور اپنے کردار کی بنیاد پر ابدی عذاب یا دائمی نعمتوں سے سرشار ہوتے ہیں

۲) عہد عتیق میں اخروی زندگی کے بارے میں بہت کم بیان ہوا ہے اس کے باوجود اس کے متعلق صریحی جملے موجود ہیں ۔

۳) عہد جدید اور چار انجیلوں میں مکرر و صریح طور پر قیامت اور حیات جاوداں کا تذکرہ ہے۔ خصوصاً انجیل متی میں زیادہ صراحت کے ساتھ قیامت کا بیان ہے ۔

سوالات

۱) آئین زرتشت میں مسئلہ معاد کس طرح بیان ہوا ہے ؟

۲) کیا تورات میں انسان کی نئی زندگی کا تذکرہ ہے ؟

۳) عہد جدید میں مسئلہ معاد کس طرح بیان ہوا ہے ؟

۴) مسئلہ معاد کی اہمیت کی وضاحت کیجئے ؟

۵) معاد کے فطری ہونے کی وضاحت کیجئے ۔

معاد محال نہیں

- معاد قرآن کی نظر میں
- خدا کی لامحدود قدرت
- عالم طبیعت میں قیامت کے نمونے
- خلاصہ
- سوالات

معاد، قرآن کی نظر میں

مسئلہ قیامت و معاد قرآن مجید میں تفصیلی طور پر بیان ہوا ہے اور اسے بہت اہمیت دی گئی ہے۔ اس سے قبل ہم نے مسئلہ معاد کا آسمانی کتابوں اور پہلے مذاہب کے لحاظ سے جائزہ لیا تھا۔ جس سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ پہلے مذاہب نے صرف روز قیامت کے بارے میں خبر دی ہے اور اس کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔

لیکن قرآن مجید نے قیامت کی تصریح اور اس کی خوفناکیوں کے بیان سے قطع نظر اس کے متعلق استدلال و اثبات پیش کئے ہیں اور معاد کے منکروں کے اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں۔

قرآن کے استدلالات ان جوابات کا مجموعہ ہے کہ جو قیامت کے منکرین کو دیئے گئے ہیں۔ ان جوابات میں سے بعض اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ قیامت کے بارے میں کوئی شک نہیں ہے۔ حقیقت میں یہ ان لوگوں کے جواب ہیں جو کہ قیامت کو امر محال کہتے ہیں بعض آیات کا حصہ اس سے بڑھ کر یہ بیان کرتا ہے کہ قیامت کے نمونے تمہیں اسی مادی دنیا میں مل سکتے ہیں بعض آیات کے حصہ نے اس سے آگے بڑھ کر کہا قیامت کا وجود ایک لازمی امر ہے۔

خدا کی لامحدود قدرت

قرآن کی بعض آیتیں خدا کے قادر مطلق ہونے کو بیان کرتی ہیں اور قیامت کے متعلق بحث کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ خدائے حکیم کا ارادہ یہ ہے کہ قیامت آئے اور اس کے ارادہ کو کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ جس طرح اس نے پہلی بار اپنی وسیع قدرت سے مخلوق و حیات کو وجود بخشا، کائنات اور انسان کو پیدا کیا دوبارہ اسی قدرت و ارادہ سے زندہ کرے گا۔

وضرب لنا مثلاً و نسی خلقه قال من یحیی
العظام و ھی رمیم قل یحییھا الّذی انشاھا
اوّل مرّۃ و ھو بکلّ خلق علیم[1]

"اور (انسان) ہمارے سامنے مثال پیش کرنے لگا اور اپنی خلقت کو بھول گیا اور کہنے لگا کہ جب ہڈیاں خاک ہو جائیں گی تو انھیں کون زندہ کرے گا۔ کہدیجئے کہ وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی بار حیات عطا کی تھی اور وہ ہر مخلوق سے واقف ہے۔"

یہ آیتیں اس کافر کا جواب ہیں جو کہ ہاتھ میں گلی ہوئی ہڈی لئے ہوئے تھا انھیں مسل کر پوڈر بنا دیا تھا اور ہوا میں اڑا کر کہہ رہا تھا ان ذرات کو کون زندہ کر سکتا ہے؟ قرآن اس کے جواب میں فرماتا ہے۔ "جس نے انھیں

---

[1] یٰسین / ۷۸، ۷۹

پہلی بار پیدا کیا تھا وہی دوبارہ زندہ کرے گا۔"

انسان کبھی اپنی طاقت و توانائی کو مدنظر رکھتے ہوئے امور کو ممکن و محال میں تقسیم کردیتا ہے جب وہ کسی کام کو اپنی قدرت و تصور سے باہر دیکھتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ یہ امر محال ہے۔ قرآن فرماتا ہے: انسان کا دوبارہ زندہ ہونا انسان کی طاقت و قدرت کے اعتبار سے امر محال ہے۔ لیکن جس طاقت نے اسے پہلی بار حیات عطا کی تھی اس کے بارے میں بھی کچھ سوچا ہے؟ ظاہر ہے اس قدرت کے لئے یہ امر محال نہیں ہے۔

عالم طبیعت میں قیامت کے نمونے

ہم ہر سال دیکھتے ہیں کہ زمین شادابی اور ہری بھری ہونے کے بعد افسردہ اور مردہ ہوجاتی ہے۔ اور فصل کے بدل جانے کے بعد پھر دوبارہ زندہ ہوجاتی اسی طرح کائنات کا نظام بھی ایک روز خاموش ہوجائے گا۔ سورج، چاند و ستارے سب خاموش ہوکر پراگندہ ہوجائیں گے اور پوری کائنات موت کے سناٹے میں ڈوب جائے گی۔ لیکن یہ دائمی موت نہیں ہے۔ کائنات کے تمام موجودات از سر نو دوبارہ زندہ ہوں گے۔

فرو شدن چوب دیدی برآمدن بنگر ٭ غروب شمس و قمر را چرا زیان باشد؟
کدام دانہ فرورفت درزمین کہ نرست ٭ چرا بہ دانہ انسانت این گمان باشد؟

"تم نے لکڑی کے ڈوبنے کو دیکھا، اس کے نکل آنے کو بھی دیکھو، چاند، سورج کے غروب پر کسے اعتراض ہوگا وہ کونسا دانہ ہے جو زمین میں ڈالا

گیا اور اگا نہ ہو پس انسان کے بارے میں یہ خیال کیوں ہے ؟

ہم ہر سال زمین کی موت و حیات کو ملاحظہ کرتے ہیں اور اپنی عمر میں اس موت و حیات کے نظام کو بار ہا اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اس طرح مردہ زمین میں بہار کی حیات نو پیدا ہوتی ہے اور مادہ اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے لیکن اس پر ہم کو کوئی تعجب نہیں ہوتا۔

لیکن اگر ہم انسانوں کی عمر کے بارے میں یہ فرض کریں کہ وہ چند ماہ سے زیادہ نہیں ہوتی، اور دوسری طرف ہم زمین کی سالانہ گردش اور نظام طبیعت کی دگرگونی سے آگاہ نہ ہوں تو اس صورت میں چونکہ ہم نے زمین کی موت اور اس کی تجدید حیات کو نہیں دیکھا ہے۔ لہذا ہرگز اس بات کو تسلیم نہیں کریں گے کہ زمین مردہ ہونے کے بعد دوبارہ زندہ ہو گئی ہے۔ ایک مچھر، جو کہ بہار کے زمانہ میں پیدا ہوتا ہے اور خزاں و سردی کے زمانہ میں مر جاتا ہے (اس) کے لئے باغ کی تجدید حیات کا تصور نا ممکن ہے۔

کیا وہ کیڑا اور مچھر جو کہ درخت کے اوپر زندگی گذارتے ہیں اور ان کی کل کائنات درخت اور باغ ہوتی ہے کیا وہ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ ان کی دنیا اس سے بڑے نظام مزرعہ (کھیت) کے تابع ہے۔؟ اور اس کی تقدیر اسی مزرعہ (کھیت) کی تقدیر سے وابستہ ہے؟ اس سے وسیع تر نظام کا تصور جیسے چراگاہ، جنگل، جزیرہ، زمین اور شمسی نظام کا تصور کیسا ہے؟

ہم کیا جانتے ہیں، ممکن ہے پورا شمسی نظام، ستارے، کہکشائیں، اور جس کو ہم مادی دنیا کے نام سے پہچانتے ہیں وہ سب ایک کلی نظام کے تابع ہوں۔

اور دنیائے طبیعت کے لحاظ سے جن کروڑوں برسوں کا ہم کو علم ہے ممکن ہے وہ ایک فصل ہو یا ایک فصل کے ایک دن کے برابر ہو اور یہ فصل حیات، زندگی کی خاموشی اور افسردگی والی فصل میں تبدیل ہو جائے، آخر کار وہ کلی نظام کہ جس کے اجزا، نظام شمسی اور کہکشانیں ہیں وہ زندگی کا دوسری صورت سے آغاز کریں

واذالشمس کوّرت واذاالنّجوم انکدرت
واذاالجبال سیّرت [1]

"جب سورج تاریک ہو جائے گا۔ اور ستارے ماند پڑ جائیں گے
اور پہاڑوں کو چلایا جائے گا۔"

قرآن مجید زمین کی موت و حیات کو مثال کے عنوان سے ذکر کرتا ہے، "تاکہ ہم اس کو کلی نظام کا ایک چھوٹا سا نمونہ سمجھیں اور قیامت کو بعید شمار نہ کریں

واللہ الذی ارسل الریاح فتثیر سحاباً فسقناہ
الی بلد میت فاحیینا بہ الارض بعد موتہا
کذالک النشور [2]

"اللہ وہی ہے کہ جس نے ہواؤں کو بھیجا کہ جو بادلوں کو اٹھاتی ہیں اور ان کو مردہ زمینوں پر لے جاتی ہیں پس ہم ان کے ذریعہ مردہ زمینوں کو زندہ کرتے ہیں، یہی مثال قیامت کی ہے۔"

---

[1] تکویر / ۱ تا ۲

[2] فاطر / ۹

وترى الارض هامدة فاذا انزلنا عليها
الماء اهتزت وربت وانبتت من كل زوج
بهيج ذالك بان الله هوالحق وانه
يحيى الموتى وانه على كل شئ قدير۔ٔ

اور تم نے مردہ وافسردہ زمینوں کو دیکھا ہے پس جب ہم نے
ان پر بارش برسائی تو حرکت میں آگئی اور ہر قسم کے سرسبز
وشاداب پودے اگا دیئے یہ اس لئے ہے کہ خدا ہی حق ہے
اور وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"

ئە حج / ۵، ۶

خلاصہ

۱۔ قرآن مجید نے قیامت کے اعلان و تصریح کے علاوہ اس کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے استدلال کیا ہے۔ اور معاد کے منکروں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔

۲۔ قرآن مجید نے معاد پر دو طریقوں سے استدلال کیا ہے ایک ان لوگوں کے اعتراض کا جواب ہے، جو قیامت کو محال تصور کرتے ہیں درحقیقت یہ آیات معاد کے امکان کو ثابت کرتی ہیں۔ اور دوسرا معاد کا اثبات کرتا ہے اور اس کے لازم و ضروری ہونے کو بیان کرتا ہے۔

۳۔ وہ بعض آیات جو معاد کی وضاحت کرتی ہیں وہ قیامت کے بارے میں قدرت خدا پر اعتماد کرتی ہیں اور ان میں سے بعض اسی دنیائے طبیعت میں قیامت کے نمونے پیش کرتی ہیں اور پھر نتیجہ کے طور پر کہتی ہیں کہ قیامت کے وجود میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

سوالات

۱۔ قرآن مجید نے معاد کے بارے میں کس طرح بحث کی ہے؟

۲۔ معاد کے ممکن ہونے کے بارے میں خدا کی قدرت مطلقہ کو مد نظر رکھتے ہوئے بحث کیجئے۔

۳۔ معاد کے ممکن ہونے کی، دنیائے طبیعت کے نمونوں کو مد نظر رکھتے ہوئے تشریح کیجئے۔

۴۔ قیامت کے بارے میں قرآن کے استدلالات کتنی قسموں میں تقسیم ہوتے ہیں؟

معاد ضروری ہے

- عدل الہی کے پرتو میں
- حکمت الہی کے پرتو میں
- خلاصہ
- سوالات

معاد ضروری ہے

اس سے قبل بیان ہو چکا ہے کہ قرآن مجید نے مسئلہ معاد پر دو طریقوں سے استدلال کیا ہے ایک حصہ معاد کے امکان کو بیان کرتا ہے اور ان لوگوں کا جواب ہے جو کہ قیامت کو امر محال تصور کرتے ہیں اور آیتوں کا دوسرا حصہ قیامت کو امر ضروری قرار دیتا ہے اور اسے کائنات کی حکیمانہ تخلیق کا نتیجہ شمار کرتا ہے۔ یہ حصہ بھی معاد کے اثبات کے لئے دو طریقے بتاتا ہے اور قیامت کو دو طرح امر ضروری قرار دیتا ہے۔

عدل الٰہی کے پرتو میں

عدالت کے معنی یہ ہیں کہ مستحق لوگوں تک حق بغیر کم و کاست پہنچ جائے اگر حقداروں کو حق نہ دیا جائے تو یہ خلاف عدل ہے۔ چنانچہ اگر بعض کو حق دیا جائے اور بعض کو نہ دیا جائے تو یہ بھی عدالت کے خلاف ہے۔

اگر ایک ماسٹر امتحان میں طلبا کو اس سے کم نمبر دیتا ہے کہ جس کے وہ مستحق ہے تو یہ بھی عدل کے خلاف ہے اسی طرح اگر ماسٹر بعض طلباء کو اتنے ہی نمبر دیتا ہے جتنے کہ وہ مستحق ہیں اور کچھ طلبا کو کم نمبر دیتا ہے تو بھی اس نے عدل کے منافی عمل کیا ہے[1]۔

[1] حیات اخروی صہ ۵۰

خداوند عالم انسان کو اس دنیا میں نیک اعمال بجالانے کی دعوت دیتا ہے۔ اور لوگوں کو ایمان و نیکی کی طرف بلاتا ہے۔ بعض نے اس دعوت کو قبول کیا اور اپنے فکری نظام اور عملی و اخلاقی منصوبوں کو الٰہی قوانین کے مطابق ڈھالیا اور بعض نے خدا کی دعوت کو قبول نہیں کیا اور ظلم و ستم اور فتنہ و فساد میں پڑ گئے۔

دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس دنیا کا نظام یہ نہیں ہے کہ یہاں نیکوکاروں کو سو فیصد جزا دی جائے اور بدچلن لوگوں کو سزا دی جائے۔ اس دنیا میں ایسا وسیع میدان نہیں ہے کہ جہاں تمام نیکیوں کی جزا اور ساری برائیوں کی سزا دی جاسکے بعض افراد نیک کام انجام دیتے ہیں لیکن ان کی زندگی کے اختتام تک جزا کی گنجائش نہیں رہتی ہے اور دوسرے گروہ کے ذریعہ بعض برے کام انجام پائے ہیں کہ جنکی سزا کی گنجائش انسان کی حیات میں نہیں ہوتی ہے۔ اس بنا پر خدا کے عدل کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسرا جہان ہو جہاں نیک افراد اپنے نیک کاموں کی جزا پائیں اور بدکار بھی اپنی کیفر کردار کو پہنچیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو خدا کی عدالت کے برخلاف ہوگا، قرآن نے بھی چند جگہوں پر اس استدلال کو بیان کیا ہے۔

"ولا تحسبن اللہ غافلا عما یعمل الظالمون انما یوخرھم لیوم تشخص فیہ الابصار۔"[1]

تم ہرگز یہ گمان نہ کرو خدا ظالموں کے کرتوت سے غافل ہے

---

[1] ابراھیم/۲۱

بلکہ انھیں فوراً سزا نہیں دیتا اور انھیں اس دن تک کی مہلت دیتا ہے جس دن ان کی آنکھ کے ڈھیلے پتھر آ جائیں گے۔

دوسری آیت میں فرماتا ہے:

"ام نجعل الذین آمنوا و عملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار" [1]

"کیا جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے انھیں ہم ان کے برابر کر دیں جو زمین میں فساد پھیلایا کرتے ہیں؟ یا پرہیزگاروں کو بدکاروں کے مثل بنا دیں؟

حکمت الٰہی کے پرتو میں

ہم جو نیک کام انجام دیتے ہیں ان کا کوئی مقصد مد نظر ہوتا ہے۔ کوئی عقل مند بھی بغیر مقصد کے کوئی کام انجام نہیں دیتا، جتنا وسیع منصوبہ ہوتا ہے اسی تناسب سے اس کا مقصد بھی عالی اور اہم ہوتا ہے۔

ہم جس چیز کے خواہش مند ہیں وہ یہ ہے کہ ہم جو کام انجام دیتے ہیں ہمیں ان کا ثمرہ ملے۔ اس بنا پر انسان کے حکیمانہ کاموں کے یہ معنی ہیں کہ ان میں کوئی مقصد پوشیدہ ہو۔ لیکن خداوند عالم اپنی ضرورت کو رفع کرنے یا سعادت

---

[1] ص / ۲۸

وکمال تک پہنچنے کے لئے کوئی کام انجام نہیں دیتا ہے۔ وہ بے نیاز اور غنی مطلق ہے۔ پس خداوند عالم کے حکیمانہ کام یہ ہیں کہ وہ مخلوق کو اس کمال تک پہنچا دے جو اس کے شایان شان ہے، اگر کوئی شخص ایک عمارت کا کچھ مصالحہ فراہم کرے اور ایک عمارت بنائے تو اس کا کام حکمت کے مطابق ہے۔ لیکن اگر کامل عمارت بنانے کے بعد اسے دھماکے سے اڑا دے اور دوبارہ پھر اس کے مصالح جمع کرنے کے لئے پھرنے لگے تو یہ خلاف حکمت ہے، انسان نے اپنے ارتقائی مراحل میں سے جماد، نباتات اور حیوان طے کر لئے ہیں اور ہر مرحلہ کے بعد زیادہ کمال حاصل کیا ہے پس اگر انسان کی اخروی حیات نہ ہو اور مرنے کے بعد خاک ہو جائے تو یہ خدا کی حکمت کے خلاف ہے۔

اس بیان سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ انسان کے لئے فنا و نابودی کا تصور ایک بیہودہ تصور ہے۔ بلکہ خدا کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ تمام موجودات خصوصاً انسان جو کہ کائنات ہستی کا ماحصل ہے، ان کا کوئی مقصد ہونا چاہیئے اور انہیں شائستہ کمال تک پہنچنا چاہئے۔

افحسبتم انما خلقناکم عبثا و انکم الینا لا ترجعون۔[1]

کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں فضول پیدا کیا ہے اور ہماری طرف پلٹ کر نہیں آؤ گے؟

---

[1] مومنون / ۱۱۵

وما خلقنا السماء والارض وما بینهما
باطلاً ذالك ظن الـذین کفـروا
فـویل للـذین کفـروا من النار[1]

"اور ہم نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے
عبث نہیں پیدا کیا ہے یہ ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے
کفر اختیار کیا ہے اور وائے ہو ان لوگوں پر جو جہنم کا انکار کرتے
ہیں۔"

---

[1] ص / ۲۷

خلاصہ

۱) قرآن مجید کی چند آیتیں قیامت کو امر ضروری قرار دیتی ہیں اور اس کے اثبات کو دو طریقوں سے بیان کرتی ہیں: ایک خداوند عالم کی حکمت سے دوسرے پروردگار کی عدالت سے۔

۲) چونکہ اس جہان میں نیکو کاروں کو جزا اور گناہگاروں کو کیفر کردار تک نہیں پہنچایا جا سکتا لہٰذا ایک دوسرے جہان کا ہونا ضروری ہے کہ جس میں ہم سب اپنی جزا و سزا کو پہنچ سکیں۔

۳) اگر موت سے انسان کی زندگی ختم ہو جائے اور اس کے بعد کوئی اور زندگی نہ ہو تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ خدا نے فضول و عبث کام انجام دیا ہے، جبکہ خدا اس سے پاک ہے۔ پس انسان کی خلقت کا کوئی مقصد ضرور ہے اور زمین و آسمان کے بنانے میں کوئی غرض پوشیدہ ہے اور یہ معاد کا مستلزم ہے۔

سوالات:

۱) قرآن مجید نے معاد کے اثبات کے لئے کونسے طریقے بیان کئے ہیں؟

۲) عدالت کے مفہوم کی وضاحت کیجئے۔

۳) عدل الٰہی کے پرتو میں معاد کو ثابت کیجئے۔

۴) انسان کے حکیمانہ کام اور خدا کے حکیمانہ فعل میں کیا فرق ہے؟

۵) حکمت الٰہی کے پرتو میں معاد کو ثابت کیجئے۔

انسان کا الٰہی جنبہ

- موت کی ماہیت
- خلاصہ
- سوالات

موت کی ماہیت

اسلام کے نقطۂ نظر سے موت نابودی اور فنا کا نام نہیں ہے بلکہ ایک دنیا سے دوسری دنیا کی طرف منتقل ہونے کا نام ہے چنانچہ پیغمبر کا ارشاد ہے :

ماخلقتم للفناء بل خلقتم للبقاء و انّما تنقلون من دار الیٰ دار[1]

" تم فنا کے لئے پیدا نہیں کئے گئے ہو بلکہ بقا کے لئے پیدا کئے گئے ہو اور صرف ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف چلے جاتے ہو۔"

قرآن مجید میں موت کو مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے ، چنانچہ اسلامی ثقافت میں اس کے لئے متعدد کلمات استعمال ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اس حقیقت کی ایک وجہ بیان کرتا ہے ۔ موت کے لئے قرآن میں استعمال ہونے والی تعبیروں میں سے ایک لفظ " توفی " ہے ۔ توفی وفا سے مشتق ہے جو کہ کسی چیز کو بغیر کم و کاست لینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ، جیسے " توفیت المال " یعنی میں نے بغیر کم و کاست کے مال لے لیا ہے ۔

قرآن مجید کی چودہ[14] آیتوں میں لفظ " تَوَفّی " موت کے معنی میں استعمال

---

[1] بحار الانوار ج ۶ ص ۲۴۹

ہوا ہے جو کہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ انسان میں ملکوتی پہلو موجود ہیں اور اس الٰہی جنبہ کے پرتو میں انسان موت کی وجہ سے فنا نہیں ہوتا ہے بلکہ بغیر کسی کم و کاست کے خدا کے غیبی نمائندوں کی تحویل میں چلا جاتا ہے، ان آیات سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ انسان فقط اسی مادی پیکر کا نام نہیں ہے بلکہ مادی جنبوں کے علاوہ اس کی شخصیت میں ایک اور حقیقت دخیل ہے جو کہ مادی خصوصیتوں سے پاک ہے، انسان کے اسی غیر مادی پہلو کو قرآن مجید نے متعدد آیتوں میں روح و نفس سے تعبیر کیا ہے۔ اسلامی روایات میں بھی اس کے وجود کی تصریح ہوئی ہے۔ انسان اسی روح اور الٰہی پہلو کے پرتو میں فنا و موت سے دوچار نہیں ہوتا ہے بلکہ موت کے بعد ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔

جن آیتوں میں موت کے لئے لفظ "توفّی" استعمال ہوا ہے ان میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان موت سے فنا نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کی حیات کے سفر کا محور بدل جاتا ہے کیونکہ ان آیتوں میں موت کے فوراً بعد حیاتی اعمال کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جیسا کہ انسانوں کی طرف گفتگو اور امید و آرزو کی نسبت دی گئی ہے۔ یہ تمام چیزیں واضح طور پر حقیقی زندگی کی تائید کرتی ہیں۔ اس سلسلہ میں چند آیتیں ملاحظہ فرمائیں۔

ان الذین توفیھم الملائکة ظالمی انفسھم
قالوا فیم کنتم، قالوا کنا مستضعفین فی الارض
قالوا الم تکن ارض اللہ واسعة فتھاجروا
فیھا فاولئک ماویٰھم جھنم وساءت مصیراً (نساء/۹۷)

بے شک جن لوگوں کی فرشتوں نے اس وقت روح قبض کی جس وقت وہ ظلم کر رہے تھے اور فرشتوں نے ان سے کہا: تم نے کس حالت میں زندگی گزاری؟ انہوں نے کہا: ہم تو روئے زمین پر بیکس وناچار تھے، تو فرشتوں نے ان سے کہا: کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ وہاں ہجرت کر کے چلے جاتے؟ پس ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

ان آیتوں میں مرنے کے بعد انسان سے فرشتوں کی گفتگو کا تذکرہ ہے واضح ہے کہ اگر تمام انسانوں کے بدن بے حس و بے شعور ہوں گے تو فرشتوں کی گفتگو بے فائدہ ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اس دنیا سے رخت سفر باندھنے کے بعد دوسری آنکھوں، کانوں اور زبان کے ذریعہ فرشتوں اور غیبی نمائندوں سے گفتگو کرتا ہے۔

قالوا اذا ضللنا فی الارض انا لفی خلق جدید بل ھم بلقاء ربھم کافرون قل یتوفیکم ملک الموت الذی وکل بکم ثم الی ربکم ترجعون [۱]

اور یہ لوگ کہتے ہیں جب ہم زمین میں ناپید ہو جائیں گے تو کیا پھر ہم کوئی خلقت ملے گی؟ حقیقت یہ ہے یہ — دشمنی کی بنا پر — اپنے پروردگار کی ملاقات کے منکر ہیں۔ آپ کہدیجئے کہ ملک الموت

[۱] سجدہ / ۱۰ و ۱۱

جو تمہارے اوپر تعینات ہے وہ موت کے وقت تمہیں جوں کا توں اٹھا لے گا اور اس کے بعد تمہیں خدا کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔"

قرآن مجید ان آیتوں میں معاد کے منکروں کے ایک اعتراض کا جواب دیتا ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ مرنے کے بعد ہمارے بدن کا ہر ذرہ ناپید ہو جاتا ہے اور ہمارے جسم کا کوئی عضو باقی نہیں رہتا ہے۔ تو پھر ہمارا دوبارہ زندہ ہونا کیسے ممکن ہے؟

قرآن مجید ضمنی طور پر اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ یہ اعتراضات بہانے بازی ہیں اور یہ لوگ عناد و دشمنی کی بنا پر ان کا اظہار کرتے ہیں، جواب دیتا ہے کہ تم کامل اور تمام چیزو خداوند عالم کے فرشتوں کے قبضہ میں چلے جاؤ گے۔ یہ تم ہو جو یہ گمان کرتے ہو کہ تمہارے بدن کے اجزاء ناپید ہو جانے کے بعد تم بھی ناپید ہو جاؤ گے اور کوئی اثر باقی نہ رہے گا۔

یہ آیت پوری وضاحت اور کامل صراحت کے ساتھ یہ بات بیان کر رہی ہے کہ باوجودیکہ انسان کے اعضاء ناپید ہو جاتے ہیں لیکن انسان کی حقیقی شخصیت مرنے کے بعد فرشتوں کے اختیار میں چلی جاتی ہے اور وہ مرنے سے نابود نہیں ہوتی ہے۔

خلاصہ

١) موت کے لئے قرآن مجید میں متعدد الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ان سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ انسان میں غیر مادی پہلو بھی موجود ہیں اور ان الٰہی جنبہ کی بنا پر مرنے سے نابود نہیں ہوتا بلکہ اس کی زندگی دوسری شکل میں اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔

٢) قرآن مجید کی بعض آیتوں میں مرنے کے بعد انسان کی طرف گفتگو، آرزو اور تقاضوں کی نسبت دی گئی ہے جو کہ واضح طور پر اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ انسان کی زندگی موت ہی پر تمام نہیں ہو جاتی۔

سوالات

١) توفی کس لفظ سے مشتق ہے اور اس کے کیا معنی ہیں ؟

٢) جن آیتوں میں موت کو توفی سے تعبیر کیا گیا ہے ان سے آپ کیا سمجھتے ہیں ؟

٣) جو لوگ روح کے وجود کا عقیدہ رکھتے ہیں، اپنے مدعا پر انکی کیا دلیل ہے ؟

٤) جن آیتوں میں موت کو توفی سے تعبیر کیا گیا ہے ان میں سے کسی ایک کی وضاحت کیجئے۔

عالم برزخ!

- قیامت صغریٰ
- برزخ
- برزخ کی زندگی قرآن کی نظر میں
- خلاصہ
- سوالات

عالم برزخ

اس سے قبل بیان ہو چکا ہے کہ مرتے وقت انسان کی پوری شخصیت وحقیقت یعنی روح بغیر کسی کم وکاست کے خدا کے فرشتوں کے اختیار میں چلی جاتی ہے جہاں کسی قسم کی نابودی اور فنا کا گزر نہیں ہے ہاں آدمی کا بدن پراگندہ ہو جاتا ہے لیکن انسان کی حقیقت، روح ہے وہ باقی رہتی ہے۔

قیامت صغریٰ

مرتے وقت انسان ایک دنیا کا نظارہ کرتا ہے اور اس کے حقائق کا مطالعہ کرتا ہے کہ زندگی میں جس سے غافل رہتا تھا اب یہ محسوس ہوتا ہے جیسا کہ وہ دسیوں سال کے بعد نیند سے بیدار ہوا ہو، اس کے سامنے عظیم حقیقتیں آجاتی ہیں۔ اس بنا پر موت ایک قسم کی بیداری ہے یعنی برزخ میں انسان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور اس دنیا سے آشنا ہوتا ہے جو کہ اس مادی دنیا سے کہیں زیادہ حقیقی ہے۔

دوسری طرف موت سے، مادی لگاؤ، عزیز داری کے روابط اور انسان کے اجتماعی پیوند نے اسے دنیادار بنا دیا تھا وہ یکایک ٹوٹ جاتے ہیں اور خواب میں تبدیل ہو جاتے ہیں وہ لمبی لمبی امیدیں کہ جن کے لئے انسان نے ایک عمر کھپائی تھی وہ سراب نظر آتی ہیں۔ تو یکبارگی وہ لگاؤ اور انسیت اس کے جسم

وجان میں تشنج و اضطرات پیدا کر دیتی ہیں، اسی لئے تو حضرت علیؑ نے فرمایا تھا:
"جو بھی مرتا ہے اس کے لئے قیامت برپا ہو جاتی ہے[1]۔ چنانچہ اسی وجہ سے موت کو قیامت صغریٰ بھی کہتے ہیں۔"

برزخ

جو چیز دو اشیاء کے درمیان حائل ہوتی ہے یا ان کے درمیان فاصلہ قائم کر دیتی ہے اسے برزخ کہتے ہیں موت سے روح عالم طبیعت سے خارج ہوتی ہے اور اس دنیا میں قدم رکھتی ہے جو کہ مادی اور اخروی دنیا کے بیچ واقع ہے اسی لئے اسے بھی برزخ کہتے ہیں، موت سے قیامت تک انسان برزخی حیات بسر کرتا ہے۔ وہ مرنے کے بعد بے ہوشی کی زندگی نہیں گزارتا ہے کہ جسے کسی چیز کا احساس ہی نہیں ہوتا، انسان مرنے کے بعد بلافاصلہ حیات کے دوسرے مرحلہ میں داخل ہو جاتا ہے اور تمام چیزوں کا احساس کرتا ہے، یا لذت اندوز ہوتا ہے یا تکلیف اٹھاتا ہے ظاہر ہے مسرت و مصیبت کا تعلق اس دنیا کے اعمال و اخلاق سے ہے۔

اس سے قبل یہ بیان ہو چکا ہے کہ قرآن مجید نے موت اور قیامت سے قبل مختلف زندگیوں کی تائید کی ہے اور تقریباً پندرہ آیتوں میں اسے برزخی حیات قرار دیا ہے کہ انسان موت اور قیامت کے درمیان حقیقی زندگی گذارتا ہے۔

---

[1] محجۃ البیضاء، ج ۸ ص ۲۹۷

برزخ کی زندگی قرآن کی نظر میں

برزخی حیات کے بارے میں جو آیتیں نازل ہوئی ہیں وہ نیکوکار اور صالح، اسی طرح بدکار و مفسدوں کی فرشتوں سے گفت و شنید کو بیان کرتی ہیں جو کہ موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔

حتیٰ اذا جاء احدھم الموت قال رب ارجعون
لعلی اعمل صالحاً فیما ترکت، کلا انھا کلمۃ
ھو قائلھا ومن ورائھم برزخ الیٰ یوم
یبعثون۔[1]

"یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آتی ہے تو وہ کہتا ہے پروردگارا! تو مجھے اس جگہ واپس کر دے جس کو میں چھوڑ آیا ہوں شاید صالح اعمال بجا لاؤں۔ ہرگز نہیں؛ یہ فقط کہنے کی باتیں ہیں جنھیں وہ بک رہا ہے اور ان کے سامنے موت سے قیامت تک برزخ ہے۔"

علوم اسلامی کے دانشوروں نے اسی آیت سے برزخ کی اصطلاح ایجاد کی ہے اور دنیا کے بعد قیامت سے پہلے والے زمانہ کو برزخ کا نام دیا ہے مرنے کے بعد حیات انسانی کے جاری رہنے کے سلسلہ میں یہاں تک بیان ہوا ہے کہ

---

[1] مومنون / ۱۰۰

انسان پشیمانی اور ندامت کا اظہار کرتا ہے اور دنیا میں لوٹ جانے کا تقاضا کرتا ہے لیکن اس کو منفی جواب دیا جاتا ہے، واضح ہے کہ انسان کو مرنے کے بعد زندہ رہنا چاہئے کہ جس سے دنیا میں لوٹ جانے کی تمنا کرے۔

دوسری آیات میں ہے کہ فرشتے گفت و شنید کے بعد صالح اور نیکوکاروں کو یہ بشارت دیتے ہیں کہ اس کے بعد وہ سعادتمندانہ زندگی گذاریں گے مزید کہتے ہیں کہ تم خدا کی نعمتوں سے سرفراز ہوگے اور انھیں قیامت کے انتظار میں نہیں چھوڑتے ہیں۔

"قیل ادخل الجنۃ قال یالیت قومی یعلمون
بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین"[1]

(مرنے کے بعد اس سے) کہا گیا جنت میں داخل ہو جاؤ تو اس نے کہا اے کاش میری قوم ـــ کہ جس نے میری باتیں نہیں سنی تھیں۔ اب جان لیتی کہ کس طرح میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا اور مجھے اپنے معزز بندوں میں شامل کر لیا ہے۔

اس سے پہلی والی آیتوں میں اس نیک سرشت انسان (مومن آل یس) کی اپنی قوم والوں سے ایک گفتگو بیان ہوئی ہے۔ یہ اپنی قوم والوں کو ان رسولوں کی پیروی کی طرف بلاتے تھے جو انطاکیہ کے لوگوں کو خدا کی خالص عبادت کی دعوت دیتے تھے۔ یہ ان رسولوں پر ایمان لانے کے بعد اپنے عقیدہ کا

---

[1] یسٓ/ ۲۶ و ۲۷

اعلان کرتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ میری باتوں کو سنو اور میری راہ پر چلو!

لوگوں نے ان کی بات نہ مانی یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا اور وہاں انہوں نے خدا کی طرف سے اپنی مغفرت و کرامت کو مشاہدہ کیا تو آرزو کی، اے کاش میری قوم والے، جو کہ ابھی دنیا میں زندگی گذار رہے ہیں اس جہاں میں میری کامیاب وسعادت مندانہ زندگی سے آگاہ ہو جاتے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام مسائل قیامت کبریٰ سے پہلے کے ہیں کیونکہ قیامت کبریٰ میں سابق ولاحق سب حاضر ہوں گے اور کسی کا زمین پر وجود نہ ہوگا۔

کچھ آیتوں میں انسانوں سے فرشتوں کی گفتگو کا تذکرہ ہے بلکہ صاف لفظوں میں سعادتمند اور صالح اور گناہگار ومعصیت کار لوگوں کی حیات کا تذکرہ ہے:

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم یرزقون فرحین بما آتیھم اللہ من فضلہ ویستبشرون بالذین لم یلحقوابھم من خلفھم الا خوف علیھم ولا ھم یحزنون [۱]

راہ خدا میں قتل ہونے والوں کو تم ہرگز مردہ گمان نہ کرو بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کی طرف سے رزق پاتے ہیں اور خدا نے اپنے فضل وکرم سے جو کچھ انھیں عطا کیا اس پر وہ خوش ہیں اور ان لوگوں کو بشارت دیتے ہیں کہ جو ابھی ان تک نہیں پہنچے ہیں کہ

---

[۱] آل عمران / ۱۶۹، ۱۷۰

نہ ہم پر خوف طاری ہے اور نہ ہم غمگین ہوتے ہیں ۔"

دوسری آیت میں ارشاد ہے :

"وحاق بآل فرعون سوٓء العذاب ، النار یعرضون علیھا غدوا و عشیا ، و یوم تقوم الساعۃ ادخلوا آل فرعون اشد العذاب ." [1]

"اور فرعونیوں کو سخت عذاب نے گھیر لیا ، ہر صبح و شام ان کے سامنے آگ لائی جاتی ہے ۔ جب قیامت بپا ہوگی ۔ کہا جائے گا ۔ فرعونیوں کو شدید ترین عذاب میں مبتلا کیا جائے ۔"

اس آیت میں فرعون والوں کے لئے دو قسم کے عذاب کا تذکرہ ہوا ہے ایک قیامت سے قبل ہے جو کہ "سوٓء العذاب" سے عبارت ہے اور ہر روز دو بارہ ان کے سامنے آگ پیش کی جاتی اس میں وہ داخل نہیں ہوتے ہیں دوسرا عذاب قیامت کے واقع ہونے کے بعد کا ہے جسے " اشد العذاب" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس میں فرعون والوں کو داخل کیا جائے گا ۔ پہلا عذاب صبح و شام ان پر نازل کیا جاتا ہے جو کہ عالم برزخ سے مربوط ہے کیونکہ برزخ میں بھی صبح و شام اور ماہ و سال ہیں لیکن دوسرے عذاب کا تعلق قیامت سے ہے کہ جہاں صبح و شام کا وجود نہیں ہے ۔

---

[1] غافر / ۴۵ و ۴۶

خلاصہ

۱. مرتے دم انسان دوسری دنیا کا نظارہ کرتا ہے نئے حقائق سے آشنا ہوتا ہے اور ابھی تک جن چیزوں سے اس نے دل لگا رکھا تھا انھیں خیرباد کہتا ہے اس لئے اسے "قیامت صغریٰ" کہتے ہیں۔

۲. برزخ اس چیز کو کہتے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہوتی ہے چونکہ برزخ دنیا اور قیامت کے درمیان حائل ہے اس لئے اسے برزخ کہتے ہیں۔

۳. جو آیات عالم برزخ میں انسان کی زندگی بیان کرتی ہیں انکی تین قسمیں ہیں، ان میں سے بعض صالح و نیکوکار اور گناہگار لوگوں سے فرشتوں کی گفتگو کو بیان کرتی ہیں، کچھ انسانوں سے فرشتوں کی گفت و شنید کو بتاتی ہیں نیز یہ کہ فرشتے انھیں عذاب یا خدا کی نعمتوں کی بشارت دیتے ہیں اور دوسری آیتیں واضح طور پر سعادت مندانہ یا عذاب سے معمور زندگی کو بیان کرتی ہیں۔

سوالات

۱. موت کو قیامت صغریٰ کیوں کہا گیا ہے؟

۲. برزخ کیا ہے؟

۳. برزخی حیات کی، آیات قرآنی کی روشنی میں وضاحت کیجئے؟

عالم برزخ ۲

- عالم برزخ کی خصوصیات کی شناخت
- برزخ میں حساب
- خلاصہ
- سوالات

عالم برزخ کی خصوصیات کی شناخت

عالم برزخ کی خصوصیات کی شناخت، ہم مادی دنیا میں زندگی گزارنے والوں کے لئے جو کہ صرف مادی امور سے سروکار رکھتے ہیں، کامل طور پر ممکن نہیں ہے' انسان ان امور کی حقیقت سے آگاہ ہو سکتا ہے جو اس کی شناخت وادراک کے احاطہ میں ہو اور چونکہ برزخ میں مادی پہلو نہیں ہے اور بہت سی جہتوں سے بنیادی طور پر عالم طبیعت سے مختلف ہے اس لئے آدمی کامل طور پر اس کی خصوصیات کا ادراک نہیں کر سکتا۔

برزخ کی شناخت کے لئے صرف ایک راستہ ہے اور وہ غیب کی خبر دینے والوں کے کلمات اس سلسلہ میں جو کچھ ان حضرات سے منقول ہوا ہے وہ اس جہان کی خصوصیات کو بیان کرتا ہے اور عالم برزخ کی عکاسی کرتا ہے۔ چونکہ برزخ مادی نہیں ہے، اس میں اکثر وہ محدودیت نہیں ہیں جو مادی دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے اس کی وسعت وعظمت کے اوصاف بیان نہیں کئے جا سکتے۔

روایات میں عالم برزخ کی وسعت وعظمت یہ بیان ہوئی ہے کہ تمام زمین وآسمان اس کے سامنے ایسے ہیں جیسے بیابان کے مقابلہ میں ایک دائرہ۔ یہی نسبت دنیائے طبیعت اور عالم برزخ کے درمیان ہے اور بالکل یہی نسبت داخل رحم اور دنیائے طبیعت کے درمیان ہے۔ جیسا کہ رحم میں زندگی گزارنے والا جنین کم

سے باہر کی دنیا اور اس کی وسعتوں کو نہیں جان سکتا ہے اسی طرح انسان برزخ کی وسعت و خصوصیات کا ادراک نہیں کر سکتا

برزخی حیات میں بھی رنج و مسرت ہیں، لیکن وہاں کی مسرت و مصیبت کا اس دنیا کی تکلیف و لذت سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا، اس عالم کی لذتیں مادی ہونے کی بنا پر محدود اور وقتی ہیں جبکہ برزخی حیات کی لذتیں اس عالم کے لطیف ہونے کے سبب اور انسان کے ادراک کی ترقی کی وجہ سے دیرپا اور وہاں کی لذت والم بھی شدید وسخت ہیں۔

برزخ میں حساب

رموزِ وحی سے آشنا اور دین کے پیشواؤں سے جو احادیث ہم تک پہنچی ہیں ان کے مطابق قبر میں انسان سے سوالات ہوتے ہیں۔ برزخ و قبر میں حساب کتاب کی وہی نوعیت ہے جو عدالت کی طرف سے متہم شخص کی تحقیق و چھان بین کی ہے، لہٰذا انسان سے صرف ایمان و اعتقاد کے بارے میں سوالات ہوتے ہیں اور دیگر مسائل کا حساب قیامت کی عدالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ اس کلی تحقیق و بازپرسی کے بعد یا تو انسان جنت کی نعمتوں سے سرشار ہوتا ہے یا جہنم کے عذاب میں مبتلا ہوتا ہے۔

القبر اما روضة من رياض الجنة او حفرة من حفر النيران [۱]

---

[۱] محجة البیضاء ج ۸ ص ۲۹۶

"قبر یا تو جنّت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنّم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔"

بہت سی روایات میں قبر سے وہی جگہ مراد ہے کہ جہاں عالم برزخ میں ارواح رہتی ہیں، اس بنا پر قبر میں نعمتوں سے سرفراز ہونا یا عذاب میں مبتلا ہونا مثالی بدن سے مربوط ہے، عالم برزخ میں روح اسی بدن میں رہتی ہے۔

برزخ میں انسان کے اعمال کا نتیجہ

ان الیوم عمل ولا حساب وغداً حساب ولا عمل[1]

"آج عمل و کوشش کا دن ہے حساب کا نہیں، کل روز حساب ہے کوشش و کار نہیں۔"

یعنی آج جبکہ ہم مادی دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں، یہ بونے اور کام زمانہ ہے کل جہان آخرت، کاٹنے اور اپنی محنتوں کے نتیجہ کا روز ہے، یہ زمانہ پڑھنے اور امتحان کا ہے کل نتیجہ نکلنے کا دن ہے، اس بنا پر دنیا بونے اور عمل انجام دینے کی جگہ ہے موت کے بعد انسان اس سے قاصر رہے گا پھر اسے عمل کی فرصت نہیں ملے گی۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود عالم برزخ میں انسان کی روح کا مکمل طور پر دنیا سے رابطہ منقطع نہیں ہوتا ہے ممکن ہے دنیا میں کئے ہوئے

---

[1] نہج البلاغہ خ ۴۲

اعمال سے وہاں فائدہ اٹھائے۔

اس مفہوم کو ذہن سے قریب کرنے کے لئے کہنا چاہیئے کہ، انسان کے بعض منفی اعمال سے منفی یا مثبت آثار مرتب ہوتے ہیں اور بہت محدود ہوتے ہیں چنانچہ ان کا اثر بھی معین زمان و مکان سے آگے نہیں بڑھتا ہے اور بعض اعمال کا اثر نہ صرف دنیا میں ختم نہیں ہوتا ہے بلکہ آئندہ بھی طویل مدت تک ان کا اثر برقرار رہتا ہے، لیکن انسان کے بعض اعمال کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ان کا اثر عرصۂ دراز تک باقی رہتا ہے بلکہ ان کے اثر کی شعاعیں قیامت کی سرحدوں تک پہنچتی ہیں۔

جن اعمال کا اثر و نتیجہ انسان کی زندگی ہی تک محدود ہے اور مرنے کے بعد ان کے اثر کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے انھیں "آثار ما تقدم" کہتے ہیں اور جن اعمال کی شعاعوں کا اثر انسان کے مرنے کے بعد ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ حق یا باطل کا سرچشمہ بنتے ہیں، انھیں "آثار ما تأخر" کہتے ہیں۔

برزخی حیات میں انسان کی روح ان اعمال کے نتیجہ و ثواب سے بہرہ مند ہوتی ہے اور اکثر اوقات دنیا میں چھوڑے ہوئے باقیات الصالحات سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ چنانچہ اس کا عذاب یا تو کم کر دیا جاتا ہے یا درجات بڑھا دیئے جاتے ہیں۔ امام جعفر صادق ؑ کا ارشاد ہے:

"مرنے کے بعد انسان کو فقط تین خصلتوں کا ثواب ملتا ہے:

۱۔ وہ صدقہ جاریہ جو اس نے اپنی زندگی میں جاری کیا تھا اور مرنے کے بعد بھی وہ جاری ہے۔

۲۔ کوئی ہدایت کرنے والی ایسی سنت قائم کرنا جس پر اس کی

موت کے بعد بھی عمل ہوتا رہے۔

۳۔ وہ صالح فرزند جو ان کے لئے دعا کرے[1]"

اسی طرح مرنے والے کی اولاد کے وہ نیک اعمال بھی، جنھیں اس نیت سے انجام دیا جاتا ہے کہ ان کا ثواب مرنے والوں کی روح کو پہنچے ۔ وہ ان کے لئے ہدیہ شمار ہوتے ہیں اور ان کی خوشحالی و شادمانی کا باعث ہوتے ہیں۔

واضح رہے یہ ہدیئے فقط مرنے والوں کے لئے فائدہ مند نہیں ہیں بلکہ زندہ لوگوں کی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی بیٹا ماں، باپ کی زندگی میں ایسے اعمال انجام دے کہ جن سے والدین کو صدمہ پہنچے تو ان کے مرنے کے بعد نیک اعمال انجام دیکر ان کی رضامندی حاصل کرسکتا ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۳ ص ۲۹۲

خلاصہ

۱) عالم برزخ مختلف جہات سے عالم مادہ سے مختلف ہے اور ہمارے لئے، جوکہ عالم مادہ میں زندگی گذار رہے ہیں، اس کی خصوصیات کی شناخت آسان نہیں ہے۔ صرف دین کے ان پیشواؤں کی احادیث ہمیں اس کی خصوصیات بتاسکتی ہیں جو عالم غیب و شہادت سے آگاہ ہیں۔

۲) عالم برزخ میں انسان سے بازپرس ہوتی ہے اور اسی بازپرسی کی بنیاد پر وہ قبر میں جنّت کی نعمتوں سے مستفید یا عذاب میں مبتلا ہوتا ہے۔

۳) صحیح ہے کہ مرنے کے بعد انسان عمل بجالانے سے معذور ہوجاتا ہے لیکن عالم برزخ میں باقیات الصالحات سے فائدہ اٹھاسکتا ہے جو اس نے دنیا میں چھوڑے ہیں۔

سوالات:

۱) عالم برزخ کی خصوصیات کو انسان کس طرح جان سکتا ہے؟

۲) عالم برزخ میں سوالات ہوتے ہیں، وضاحت کیجئے۔

۳) آثار ماتقدم اور آثار ماتأخر کی وضاحت کیجئے۔

۴) برزخ میں انسان کے اعمال کے نتیجہ کی وضاحت کیجئے۔

۵) اولاد کے نیک اعمال مرنے والوں کو کیا فائدہ پہنچاتے ہیں؟

قیامتِ کبریٰ

- قیامت کی دہلیز پر
- قیامت کا واقع ہونا
- چیخ
- صور کا پھونکا جانا
- لوگ میدان محشر میں
- خلاصہ
- سوالات

قیامت کی دہلیز پر

قرآن کی آیات سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قیامت برپا ہونے کے ساتھ پوری کائنات میں عظیم انقلابات رونما ہوں گے اور پورا عالم تہ و بالا ہو جائے گا اس طرح دنیا کا نظام نئے مرحلے میں داخل ہوگا یہ عظیم واقعہ ستاروں کے ڈوب جانے اور سورج کے بے نور ہو جانے، دریاؤں کے خشک ہو جانے، پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو جانے، زلزلوں کے آنے اور عظیم کے آنے پر رونما ہوگا۔ دنیا کے تمام موجودات نابود و ہلاک ہو جائیں گے، تمام چیزیں خراب و ناپید ہو جائیں گی ان تخریبیوں اور انقلابات کی تعمیر کے لئے ایک نیا نظام ناگزیر ہے۔ کائنات کی دوبارہ نئے نظام کے تحت تعمیر ہوگی اور پھر ہمیشہ رہے گی۔

قرآن کی بعض آیات سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ انقلابات اور دیگر گونی ایک صور کے پھونکنے یا چیخ سے وجود میں آئیں گی۔

فاذا نفخ فی الصور نفخۃ واحدۃ وحملت الارض والجبال فدکتا دکۃ واحدۃ فیومئذ وقعت الواقعۃ وانشقت السماء فھی یومئذ واھیۃ۔[1]

---

[1] حاقہ/ ۱۶ - ۱۳

"پس جب پہلی مرتبہ صور پھونکا جائے گا اور زمین اور پہاڑوں کو اکھاڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا اس دن قیامت واقع ہو جائے گی۔ آسمان شق ہو کر بھس پھسے ہو جائیں گے۔"

قیامت کا واقع ہونا

قرآن مجید، قیامت کے برپا ہونے کو ایک "چیخ" کے پیدا ہونے اور صور کے پھونکے جانے سے مربوط قرار دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں اہل بیتؑ کی تفسیر سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ یہاں صور پھونکنے کے حقیقی معنی مراد ہیں "صور" یعنی وہ چیز جس میں پھونکنے سے بہت شدید آواز و آہنگ پیدا ہوتا ہے۔ ماضی میں فوجیں کارزار اور جنگ و پیکار کے وقت بجاتی تھیں، صور اور اس کے پھونکے جانے کی حکایت، وہی ہے جو شیپوری کی ہے، جنگ و پیکار میں یہ معمول تھا کہ ایک مرتبہ فوج کو آمادہ کرنے کے لئے پھونکا جاتا تھا اور دوبارہ حملہ کرنے کے لئے پھونکا جاتا تھا۔ قرآن مجید قیامت کے وقوع کو ذیل کے امور سے مربوط جانتا ہے۔

۱: چیخ

خداوند عالم کا ارشاد ہے:

"من ورائهم برزخ الى يوم يبعثون[1]"

[1] مومنون/۱۰۰

"اور ان کے پیچھے عالم برزخ ہے جو کہ قیامت کے دن تک قائم رہے گا"

اس آیت سے برزخ کے حکم کی عمومیت سمجھ میں آتی ہے جو کہ سب کو شامل ہے اور سب کو برزخ کی منزل طے کرنا ہے اس لحاظ سے ابتدا میں ایک چیخ کا پیدا ہونا کہ جس سے دنیا اور دنیا والوں کی بساط سمیٹ لی جائے گی اور اہل دنیا اور عالم طبیعت میں زندگی گزارنے والے اپنا بوریا بستر سمیٹ لیں گے اور عالم برزخ میں چلے جائیں گے۔

صور کا پھونکا جانا

چیخ کے بعد اپنا اور دنیا والے فنا ہو جائیں گے پھر دوبارہ صور پھونکا جائیگا پہلی مرتبہ صور پھونکے جانے سے برزخ والے مرجائیں گے اس لئے اسے مارڈالنے والا صور کہتے ہیں۔ پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا اور قیامت برپا ہوجائے گی اور لوگوں کو اٹھایا جائے گا اس لئے اسے زندہ کرنے والا صور کہا جاتا ہے۔

و نفخ فی الصور فصعق من فی السموات و من فی الارض الا من شا اللّٰہ ثم نفخ فیہ اخری فاذا ھم قیام ینظرون [1]

اور جب صور پھونکا جائے گا تو زمین و آسمان کی تمام مخلوقات بے ہوش ہو کر گر پڑیں گی علاوہ ان کے جنہیں خدا بچانا چاہے

[1] زمر / ۶۸

اس کے بعد پھر دوبارہ پھونکا جائے گا تو سب کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے۔"

لوگ میدان محشر میں

روز قیامت لوگ حکم خدا سے خاک کے پردوں سے باہر آئیں گے، ان کی یہ خلقت پہلی خلقت سے مختلف ہو گی کیونکہ پہلی تدریجی تھی اور یہ یکبارگی ہے۔

قل ان الاولین والاخرین لمجموعون الیٰ میقات یوم معلوم[1]

"آپ کہہ دیجئے کہ اولین و آخرین سب کے سب ایک مقرر دن وعدہ گاہ پر جمع کئے جائیں گے۔"

سارے انسان ایک وعدہ گاہ اور مقرر دن میں زندہ ہوں گے اور میدان محشر میں اضطراب و پریشانیوں سے دوچار ہوں گے اس روز کچھ لوگ خوش حال ہوں گے۔ ان کے چہرے نورانی و درخشاں ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے دنیا میں سچا عقیدہ اختیار کیا تھا اور حق کی اطاعت میں زندگی گذاری تھی، اور وقتی و فانی لذت کے فریب میں نہیں آتے تھے ہمیشہ راہ حق پر گامزن تھے، یہ ان لوگوں کا گروہ ہے جنھیں اس روز رنج و غم نہ ہوگا اور قیامت کے حالات انھیں رنجیدہ نہیں کریں گے بلکہ ملائکہ اور خدا کے فرشتے

---

[1] واقعہ / ۴۹ و ۵۰

ان کا استقبال کریں گے اور کہیں گے۔ یہی وہ دن ہے کہ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ لیجئے وہ روز آن پہنچا ہے جس کے انتظار میں گھڑیاں گنی تھیں اور صبر و استقامت کے ساتھ اس کے پہنچنے کا انتظار کیا تھا۔ وہ اب محرومیتوں سے فارغ اور محدودیت سے الگ رحمت خدا کے جوار میں، اپنے معبود کے لطف و کرم سے بہشت رضوان میں داخل ہو جائیں گے، خوشی و مسرت سے ان کے چہرے دمک اٹھیں گے اور دنیا میں جو انھوں نے کوشش و جانفشانی کی تھی اس کے نتیجہ اور ثواب سے راضی ہوں گے اور بلند و بالا مقام پر فائز ہوں گے۔

وجوہ یومئذ ناعمۃ لسعیہا راضیۃ فی جنۃ عالیۃ۔[1]

"اور کچھ چہرے تر و تازہ ہوں گے۔ اپنی محنت سے خوش بلند ترین جنت میں۔"

لیکن دوسرے گروہ کے چہرے ذلت سے اترے ہوئے ہوں گے ان کا سارا کام رنج و مشقت ہو گا۔

وجوہ یومئذ خاشعہ عاملۃ ناصبۃ[2]

اس دن بہت سے چہرے ذلیل اور رسوا ہوں گے، مایوس و تھکے ہوئے۔

اس گروہ کا کام دنیا میں صرف حق سے روگردانی، عناد، نفاق، ستم و

---

[1] غاشیہ ۸/ تا ۱۰

[2] غاشیہ / ۲ و ۳

گمراہی تھا، یہ اپنے لئے کوئی توشہ نہیں لائے ہیں ان کے چہرے سیاہ اوران پر پھٹکار برس رہی ہوگی۔

اس وقت قیامت کی لرزہ خیز آواز پیدا ہوگی اور انسان اپنے بھائی، ماں باپ اور اہل وعیال کی بھی پروا نہیں کرے گا۔ یہ دن وہ ہے جس میں ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی۔ اس میں کچھ چہرے شادمان و درخشاں ہوں گے اور کچھ پر ذلت و رسوائی کی خاک پڑی ہوگی یہ کافر و گناہگار ہوں گے:

"... وجوہ یومئذ مسفرۃ، ضاحکۃ مستبشرۃ و وجوہ یومئذ علیہا غبرۃ ترھقہا قترۃ اولئک ھم الکفرۃ الفجرۃ۔"[1]

بہت سے چہرے اس روز چمکتے ہوں گے خنداں وشادماں اور بہت سے چہروں پر گرد پڑی ہوگی اس پر سیاہی چھائی ہوگی وہی تو کفار وبدکار ہوں گے۔

اس بنا پر میدان محشر میں پاک وناپاک نیکوکار وگناہگار چہروں سے پہچان لیئے جائیں گے۔

یعرف المجرمون بسیماھم فیوخذ بالنواصی والاقدام[2]

گنہگار تو اپنی پیشانیوں ہی سے پہچان لئے جائیں گے اور ان کی پیشانی کے پٹے اور قدم پکڑ لئے جائیں گے۔

---

[1] عبس / ۴۲ و ۳۳

[2] رحمٰن / ۴۲

خلاصہ

(۱) قرآن کی آیتوں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قیامت برپا ہونے کے ساتھ ساتھ پوری دنیا میں عظیم انقلاب آئیں گے۔ ان تغیرات سے دنیا کا نظام مختل ہو جائے گا پھر کائنات کو نئے نظام کے تحت دوبارہ تعمیر کیا جائے گا۔

(۲) قرآن مجید قیامت کے وقوع کو چیخ اور صور پھونکے جانے سے مربوط سمجھتا ہے۔ اس طرح کہ پہلے چیخ دنیا اور اہل دنیا کا کام تمام کر دے گی اور پھر دوبارہ زندہ کر دینے والا صور پھونکا جائے گا۔

(۳) جب لوگ میدان محشر میں آئیں گے تو اس وقت ایک گروہ خندان و شادمان حقیقت کو دیکھتا ہوگا، یہی نیکو کاروں کا گروہ ہے۔ دوسرا گروہ گناہگار و کفاروں کا ہے کہ جن کے چہرے رنج و الم کی وجہ سے اترے ہوں گے اور اپنے انجام کو سوچتے ہوں گے اس طرح انھیں ان کے چہروں سے پہچان لیا جائے گا۔

سوالات

(۱) قیامت کیسے واقع ہوگی ؟

(۲) قرآن قیامت کے واقع ہونے کو کن چیزوں سے مربوط جانتا ہے ؟

(۳) نیکو کار میدان محشر میں کس صورت میں آئیں گے ؟

(۴) عرصۂ قیامت میں گناہگاروں کا کیا عالم ہوگا ؟

معادِ جسمانی

- معادِ جسمانی
- معاد روحانی
- معاد جسمانی و روحانی
- قرآن کیا کہتا ہے ؟
- کونسا بدن محشور ہوگا ؟
- خلاصہ
- سوالات

معاد جسمانی

ہم جانتے ہیں کہ معاد کو عقلی دلیلوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی شناخت کے لئے ہمیں قرآن کی آیات اور دینی پیشواؤں کی احادیث کی طرف بھی رجوع کرنا چاہئے کیونکہ موت کے بعد کی دنیا کی خصوصیات کی شناخت انسان کے علم و آگاہی سے باہر ہے اور اس کی معرفت کے لئے سوائے سرچشمۂ وحی کے اور کوئی راہ نہیں ہے۔

قیامت میں مردوں کے زندہ ہونے کی کیفیت کے سلسلہ میں مختلف نظریے ہیں ان میں سے بعض کے تذکرہ کے بعد ہم انسانوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے بارے میں قرآن کی آیات کی وضاحت کریں گے۔

۱۔ معادِ روحانی

فلاسفہ کا ایک گروہ صرف معادِ روحانی کا معتقد ہے اس کا کہنا ہے کہ مرنے کے بعد بدن سے روح کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے اور چونکہ روح مادہ سے پاک ہے اس لئے وہ فنا نہیں ہوگی۔ بدن سے جدا ہونے کے بعد وہ باقی و جاوید ہو جائے گی یہ گروہ چونکہ معاد جسمانی پر وارد ہونے والے اعتراضات کے جوابات نہیں دے سکا، اس لئے اس نے محل کے پایوں کو بنیاد کے بغیر ہی قائم

کر دیا جبکہ معمولی سے غور و فکر سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ معاد کی بحث میں انسان کے دوبارہ زندہ ہونے کی گفتگو ہے ، اور یہ گفتگو روح کے بارے میں ہے جو کہ ان کے عقیدہ کے لحاظ سے فنا پذیر نہیں ہے ،

۲۔ معاد جسمانی و روحانی

دوسرا گروہ معاد جسمانی و روحانی کا معتقد ہے وہ کہتا ہے کہ روح دوسری دنیا میں بدن کی طرف پلٹ آئے گی ۔ ہم کہہ چکے ہیں ، کہ بحث معاد کی کیفیت کے بارے میں ہے ، اس کی شناخت انسان کی عقل و فکر کے دائرہ سے باہر ہے۔ اصل میں یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ جس پر عقل بہ آسانی استدلال قائم کر سکے اسی لئے بو علی سینا نے کہا ہے کہ : " معاد کا ایک حصہ شرع کے طریق سے نقل ہوا ہے ، شریعت نے اسے قبول کیا ہے اور شریعت کے علاوہ اس کو کسی دوسری راہ سے ثابت نہیں کیا جا سکتا ۔ " اس لئے لازم ہے کہ معاد کی کیفیت کے سلسلہ میں آیات قرآنی اور دین کے پیشواؤں کی احادیث کی طرف رجوع کریں ۔

قرآن کیا کہتا ہے ؟

قرآن مجید کی آیات میں معاد اور قیامت میں انسانوں کے زندہ ہونے کے بارے میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ واضح طور پر اس بات کو بیان کرتے ہیں کہ اس دنیا میں انسانوں کی نئی زندگی ، صرف روحانی زندگی نہیں ہو گی بلکہ روح دوبارہ اسی مادی بدن میں پلٹ آئے گی ۔ قرآن کا یہ بیان

اتنا واضح ہے کہ اسلامی دانشوروں نے معاد کا انکار کرنے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیا ہے ۔ اس سلسلہ میں نازل ہونے والی آیات میں سے ہم یہاں بعض کو نقل کر رہے ہیں :

۱۔ بعض آیتوں میں ہڈیوں کے زندہ ہونے کو بیان کیا گیا ہے اور ان لوگوں کا جواب دیا گیا ہے جو کہ ہڈیوں کے زندہ ہونے کے منکر ہیں یا ان کے زندہ ہونے کو محال جانتے ہیں :

قل یحییھا الذی انشاھا اول مرۃ وھو بکل خلق علیم [۱]

کہہ دیجئے کہ ہڈیوں کو وہی زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی بار پیدا کیا تھا وہ اپنی تمام مخلوقات کو جاننے والا ہے ۔

ایحسب الانسان ان لن نجمع عظامہ ؟ بلی قادرین علی ان نسوی بنانہ ... [۲]

کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے ؟ کیوں ، ہم تو اس کی پور ، پور درست کرنے پر قادر ہیں ۔

۲۔ بعض آیات انسان کے خاک کے پردوں سے باہر آنے اور قبر سے

---

[۱] یٰس / ۷۹

[۲] قیامت / ۳ و ۴

اٹھائے جانے کو بیان کرتی ہیں :

و نفخ فی الصور فاذا ھم من الاجداث الی ربھم ینسلون۔[1]

"اور صور پھونکا جائے گا، پس وہ یکایک قبروں سے اٹھ کر اپنے پروردگار کی طرف چل کھڑے ہوں گے۔"

قبروں سے نکلنے اور گلی ہوئی ہڈیوں، خاک میں ملے ہوئے بدن کے زندہ ہونے کی تعبیر صریح طور پر اس بات کو بیان کرتی ہے کہ انسان کی دوسری زندگی اسی مادی بدن کے ساتھ ہوگی۔

کونسا بدن محشور ہوگا؟

دنیا تغیرات و انقلابات اور ارتقا سے لبریز ہے، انسان کے بدن کے خلئے ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ کچھ مرتے ہیں تو دوسرے ان کی جگہ آجاتے ہیں کہتے ہیں کہ ہر آٹھ سال کے بعد انسان کے بدن کے تمام خلئے بدل جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خلئے آجاتے ہیں اس لحاظ سے ہر آٹھ سال کے بعد ہر ایک انسان کا بدن بدل جاتا ہے اور یہ تغیرات اتنے آہستہ اور تدریجی طور پر واقع ہوتے ہیں کہ کوئی بھی ان کو محسوس نہیں کرپاتا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیامت میں ان بدنوں میں سے کونسا

---

[1] یٰسٓ / ۵۱

بدن اٹھایا جائے گا؟ ظاہر ہے تمام بدنوں کا زندہ ہونا محال ہے اور اگر ان میں سے کوئی ایک زندہ ہوگا تو وہ کون ہے؟ ہر ایک بدن کے افعال کی فائل الگ ہے ہر ایک سے نیکی یا بدی سرزد ہوتی ہیں تو پھر تمام جزائیں یا سزائیں ایک ہی بدن کو کیوں دی جائیں؟

ہمارا جواب یہ ہے: آدمی کے بدن اور اس کے مادی جنبوں میں تغیر و انقلاب کے ساتھ ساتھ انسان کی شخصیت ثابت و برقرار رہتی ہے جو کہ مادی خصوصیات سے پاک ہے اور جزا و یا سزا، اس دنیا میں یا اس دنیا میں، کا محور وہی روح ہے جس میں تغیر و انقلاب نہیں آتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی جرم کا مرتکب ہو اور دس سال کے بعد عدالت میں پہنچے اور یہ دعویٰ کرے کہ جس نے جرم کیا تھا وہ اور تھا یا وہ دوسرے ہاتھ پاؤں تھے؟ کیا اس کی یہ بات تسلیم کر لی جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ اس بنا پر جزا یا سزا کا تعلق انسان کی روح سے ہے اور مسرتوں، مصیبتوں کا مرکز انسان کی روح ہے اگر بدن کو جزا یا سزا دی جاتی ہے تو اس لئے کہ اس سے روح کا تعلق ہے۔

کلما نضجت جلودھم بدلناھم
جلوداً غیرھا لیذوقوا
العذاب۔[۱]

جب ان کی کھال جل کر بے حس ہو جائے گی تو لے دوسری

---

[۱] نساء/۵۶

کھال سے بدل دیا جائے گا تاکہ عذاب کا مزہ چکھیں"۔

اس آیت میں عذاب چکھنے کی نسبت خود انسانوں کی طرف دی گئی ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عذاب کے مزہ چکھنے میں کھال کی تبدیلی کا کوئی کردار نہیں ہے یعنی اس کا مزہ انسان چکھتے ہیں ہاں گوشت و پوست عذاب کے ادراک کا وسیلہ ہیں اور چونکہ بعض جزا و سزا کو بغیر بدن کے محسوس نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ روح کو بدن کے ذریعہ جزا و سزا کا مزہ چکھایا جائے۔ پس روح کے لئے بدن وسیلہ ہے۔

خلاصہ

(۱) بعض افراد معاد روحانی کے قائل ہیں۔

(۲) ایک گروہ قرآن مجید اور معصومینؑ کی احادیث کی روشنی میں معاد کے لئے دونوں پہلوؤں کا قائل ہے وہ کہتا ہے کہ دوسری دنیا میں روح بدن میں لوٹ آئے گی اس سلسلہ میں قرآن مجید کی آیات اتنی صریح اور واضح ہیں کہ کسی طرح انکی تاویل نہیں کی جا سکتی۔

(۳) حیات اخروی میں انسان کا بدن نعمت و عذاب آخرت کے ادراک کا ذریعہ ہے اور چونکہ بعض جزا و سزا کو بغیر بدن کے محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے بدن میں روح کا ہونا ضروری ہے۔

سوالات

(۱) معاد اور دوبارہ انسانوں کے زندہ ہونے کے سلسلہ میں کتنے نظریئے ہیں؟

(۲) معاد جسمانی کے اعتقاد میں کیا قباحت ہے؟

(۳) روحانی معاد کے عقیدہ میں کیا حرج ہے؟

(۴) معاد کے سلسلہ میں قرآن کیا کہتا ہے؟

(۵) انسان کے بدن کے خلیوں کے بدل جانے کے پیش نظر محشر میں کونسا بدن زندہ ہوگا؟

دنیا و آخرت کا فرق

- ثبات و تغیر
- خالص و ناخالص زندگی
- بونا اور کاٹنا
- مشترک و مخصوص سرنوشت
- خلاصہ
- سوالات

دنیا و آخرت کا فرق

کیا جو قوانین اور نظام مادی دنیا میں حاکم و جاری ہیں وہی اخروی دنیا میں بھی نافذ ہوں گے یا اس دنیا کے قوانین و نظام کلی طور پر اس جہاں سے مختلف ہیں؟ کیا ان دونوں نظاموں میں کچھ شباہت اور تفاوت ہے ؟

اگر دونوں جہانوں میں شباہتیں ہیں تو تفاوت بھی دونوں میں ناگزیر ہے، دنیا و آخرت کی زندگی کے مشترک پہلو یہ ہیں کہ دونوں زندگیاں حقیقی ہیں دونوں میں رنج و مسرت، لذت و تلخی موجود ہے، انسان دونوں میں روح و بدن اور اعضا و جوارح کے ساتھ زندگی گذارتا ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان دونوں زندگیوں میں بنیادی فرق بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔

ان دو نوعیت کی زندگیوں میں فرق و امتیاز کی نشاندہی کے لئے کوئی مثال دنیا صحیح نہیں ہے کیونکہ ہم جو مثال بھی پیش کریں گے اس کا تعلق دنیا سے ہوگا اور وہ دنیا کے قوانین کے تابع ہوگی لیکن اپنی بات کو ذہن سے قریب کرنے کے لئے دنیا و آخرت کو رحم مادر اور دنیا سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

بچہ بھی رحم میں ایک قسم کی زندگی گذارتا ہے اور پیدائش کے بعد دوسری نوعیت کی زندگی بسر کرتا ہے ان دونوں زندگیوں میں ایک وجہ مشترک یہ ہے کہ دونوں میں غذا کا استعمال ہے لیکن جنین کی غذا اور پیدائش کے بعد بچے کی

غذا میں فرق ہے، ماں کے شکم میں بچہ ایک پودے کی سی زندگی بسر کرتا ہے
اور ناف کے ذریعہ ماں کے خون سے غذا حاصل کرتا ہے، سانس نہیں لیتا اور
ہاضمہ کی مشین بھی کام نہیں کرتی ہے لیکن محض اس دنیا میں آنکھ کھولنے سے
اس کی زندگی میں انقلاب آجاتا ہے اب وہ پھیپھڑوں کے ذریعے سانس لیتا
ہے اور منھ کے ذریعہ غذا کھاتا ہے۔

دنیا کے بعد یہی حالت آخرت کی ہے، دونوں جہانوں میں زندگی
ہے لیکن وہاں کی زندگی کے اپنے قوانین و نظام ہیں جو کہ اس دنیا کے قوانین
سے مختلف ہیں۔ دنیائے آخرت کی عکاسی کے لئے ان میں سے بعض اختلافات
کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

ثبات و تغیر

اس دنیا میں تغیر، حرکت اور انقلاب موجود ہے۔ بچہ جوان ہوتا ہے
سن بلوغ میں قدم رکھتا ہے تو اس کے دیکھتے ہی دیکھتے نئی چیزیں پرانی
اور پرانی ردی بن جاتی ہیں۔ لیکن دنیائے آخرت میں پیری و فرسودگی کا
وجود نہیں ہے اور نہ ہی موت آئے گی۔ یہ دنیا فانی ہے اور وہ عالم بقاء۔
یہ زوال پذیر ہے وہ ثابت و برقرار ہے۔

خالص و ناخالص زندگی

اس وقت موت و زندگی ایک ساتھ مخلوط ہیں، یہاں جمادات، نباتات

حیوانات الگ وجود ہیں اور ایک دوسرے میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اس وقت ہمارے جسم کو جو بدن تشکیل دیتا ہے وہ ایک زمانہ میں جماد تھا اور ایک بار پھر جماد ہوئے گا۔ اس دنیا میں موت و حیات باہم مخلوط ہیں لیکن آخرت میں ایسا نہیں ہے۔ وہ حیات و زندگی سے لبریز ہے۔ یہاں تک کہ وہاں کی زمین درخت پیڑ پودے سب حیات رکھتے ہیں۔

وان الدار الاخرۃ لھی الحیوان[1]

"آخرت کا گھر زندگی کا گھر ہے"

آخرت میں انسان کے اعضا و جوارح میں بھی ادراک و احساس اور شعور پیدا ہو جائے گا اور فریب کار و دروغ گو کی زبان بند ہو جائیگی منہ پر مہر لگ جائے گی۔

الیوم نختم علیٰ افواھھم وتکلمنا ایدیھم وتشھد ارجلھم بما کانوا یکسبون[2]

آج ہم ان کے دہانوں پر لگام چڑھا دیتے ہیں، ان کے ہاتھ اور پاؤں ہم سے وہ سب بتادیں گے جو ان کے ذریعہ انہوں نے انجام دیا ہوگا۔

۱۔ عنکبوت / ۶۴

۲۔ یٰس / ۶۵

وقالوا لجلودھم لم شھدتم علینا ؟ قالوا انطقنا اللہ الذی انطق کل شیئ [1]

وہ کھال سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ وہ جواب دے گی مجھے اس خدا نے زبان عطا کی جس نے ہر چیز کو گویائی عطا کی ہے۔

بونا اور کاٹنا

دنیا و آخرت ایک سال کی دو فصل کی طرح ہیں، دنیا میں بویا جاتا ہے آخرت میں کاٹا جاتا ہے۔ الدنیا مزرعۃ الاخرۃ "دنیا آخرت کی کھیتی ہے" یہاں کوشش وجد و جہد کا زمانہ ہے اور وہاں نتیجہ کا وقت ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے طلباء کے امتحان کے نتیجہ نکلنے کا دن۔ اگر نتیجہ والے دن طلباء کہیں آج مجھ سے جو پوچھنا چاہتے ہیں پوچھ لیجئے، میں جواب دینے کیلئے تیار ہوں، جواب ملے گا امتحان کا زمانہ گذر چکا ہے یہ نتیجہ کا دن ہے۔

وان الیوم عمل ولا حساب وغدا حساب ولا عمل [2]

"آج جد و جہد کا دن ہے روز حساب نہیں، کل روز حساب ہے۔ عمل و کام کا نہیں۔"

---

[1] فصلت/ ۲۱

[2] نہج البلاغہ خطبہ/ ۴۲

مشترک و مخصوص سرنوشت

مادی دنیا میں انسان اجتماعی طور پر زندگی گذارتا ہے اور اجتماعی زندگی تعلق ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور ہمکاری سے ہوتا ہے۔ نیک لوگوں کے اچھے کام دوسروں کی کامیابی میں موثر ثابت ہوتے ہیں اور برے لوگوں کے غلط کام بھی معاشرہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ چنانچہ مشترک ذمہ داری بھی ناگزیر ہے، ایک معاشرہ کے افراد ایسے ہی ہیں جیسے ایک بدن کے اعضاء ایک کی فعالیت کے ثمرہ سے دوسرا فائدہ اٹھاتا ہے اور ان میں سے ایک کے مختل ہو جانے سے دوسرا بھی معطل ہو جاتا ہے۔

یہ تعاون و ہمکاری دوسروں کی سرنوشت کے لئے بہت ہی موثر ہے۔ مشترک ذمہ داری کو ثابت کرتی ہے۔ اگر یہ شخص کسی گناہ کا ارتکاب کرنا چاہتا ہے تو دوسروں پر منع کرنا واجب ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے معاشرہ پر ایک شخص کے گناہ کے اثر کو ایک مثال میں بیان فرمایا ہے:

"کچھ لوگ کشتی میں سوار تھے، کشتی سطح آب کو چیرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ ایک شخص اس جگہ سوراخ کرنے لگا جہاں بیٹھا تھا۔ دوسرے مسافروں نے اس لئے منع نہیں کیا کہ وہ اپنی جگہ سوراخ کر رہا ہے دوسروں کی جگہ سے سروکار نہیں ہے۔ نتیجہ میں کشتی غرق ہو گئی، جبکہ اگر لوگ اسے منع کرتے تو خود بھی بچ جاتے اور اسے بھی نجات دلاتے۔"

(ر۔ عدل الٰہی سے اقتباس)

اس بنا پر برے اور بدکار لوگ نیکوکاروں کے اچھے کاموں سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور کبھی نیک صالح لوگوں کو بھی بدکاروں کے افعال کے نتیجہ میں مصیبت و بلا میں گرفتار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن آخرت میں ایسا نہیں ہے۔ وہ جدائی و علیحدگی کا گھر ہے "یوم الفصل ہے" کسی شخص کو دوسرے کے کام کے نتیجہ سے فائدہ نہیں پہنچے گا اور کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا:

ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ

"کوئی کسی کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔"

خلاصہ

① جس طرح دنیا و آخرت میں کچھ مماثلت ہے اسی طرح ان کے درمیان بنیادی فرق بھی ہے بالکل ایسے ہی جیسے ماں کے شکم میں جنین کی زندگی میں اور ولادت کے بعد بچہ کی زندگی میں اساسی فرق ہے۔

② دنیوی زندگی انقلابات اور تغیرات سے لبریز ہے، اس میں موت و حیات مخلوط ہے لیکن دنیائے آخرت ثابت و برقرار ہے اور حیات سے مملو ہے۔

③ دوسرا فرق یہ ہے کہ دنیا جد و جہد کی جگہ ہے اور آخرت اس کا نتیجہ سننے کا محل ہے۔ دنیا میں انسانوں کی زندگی ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہے جبکہ آخرت میں ہر ایک کی راہ جدا ہے اور کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

سوالات:

① کیا دنیا و آخرت کے نظام میں مماثلت و تفاوت موجود ہے؟ وضاحت کیجئے۔

② بونے اور کاٹنے کے سلسلہ میں حضرت علیؑ کی حدیث کی وضاحت کیجئے

③ دنیا و آخرت میں انسانوں کی مخصوص و مشترک زندگی بیان کیجئے۔

④ آخرت حیات کا گھر ہے، مذکورہ جملہ کی وضاحت کیجئے۔

⑤ دنیا و آخرت کے بعض فرق بیان کیجئے۔

تجسّم اعمال

- اس دنیا میں انسان کے اعمال کے جلوے
- آخرت میں انسان کے عمل کے جلوے
- خلاصہ
- سوالات

آپ دنیا و آخرت کی مماثلت اور تفاوت سے واقف ہو چکے ہیں اور اس کے بعض جلوؤں کو اچھی طرح پہچان چکے ہیں، دنیا و آخرت کے تفاوت، معاد کے اہم اور تعمیری مباحث میں شمار ہوتے ہیں۔ انسان کے عمل کے جلوے، دنیا و آخرت میں جزا و سزا اور حوادث، اس بحث کے ارکان ہیں، اس کے تعمیری پہلوؤں کے علاوہ عدل خدا سے مربوط اشکالات کے واضح جوابات بھی دیئے جائیں گے۔

انسان جو عمل انجام دیتا ہے اس کی قدر و قیمت اور اس کے منفی و کمزور پہلو کے تناسب سے اس کے نتائج ہوں گے۔ یہ نتیجے تین مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں :

۱۔ معین جزا و سزا

۲۔ طبیعی اور تکوینی نتائج

۳۔ اخروی جزا و سزا (تجسم عمل)

اس دنیا میں انسان کے عمل کے جلوے

مادی دنیا میں انسان اپنے عمل کے نتیجے سے بہرہ مند ہوتا ہے اس کے

مختلف جلوے دیکھتا ہے اور جزا و سزا کو پہنچتا ہے، اس میں قانون پر عمل کرنے کو دخل ہے۔ بہرحال انسان اپنے عمل کا نتیجہ دیکھ لیتا ہے۔ انسانی معاشرے میں جو جزائیں، سزائیں معین ہیں، ان میں سے ایک اس عمل کا نتیجہ ہے جو کہ جزا یا سزا کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے، اس جہان میں دوسرے اعمال کا نتیجہ طبیعی اور تکوینی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

دنیا میں عملِ انسان کے نتیجہ کو عمل کا وضعی اثر کہا جاتا ہے، اگر کوئی زہر ہلاہل پی لیتا ہے تو زہر اسے موت کی نیند سلا دیتا ہے، یہ موت زہر کا طبیعی اور وضعی اثر ہے۔

بہت سے گناہوں کا وضعی اثر گنہگار پر اسی دنیا میں مترتب ہوتا ہے۔ شراب خوری اعصاب کو مختل کرتی ہے اور جگر دل کی بیماریوں کو جنم دیتی ہے۔ والدین کے ساتھ برا سلوک روا رکھنے کا نتیجہ اسی دنیا میں دیکھ لیتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی اپنے فاسق و فاجر والدین کو بھی ستاتا ہے تو بھی اس کا نتیجہ دیکھ لیتا ہے۔

منتصر عباسی نے اپنے باپ "متوکل" کو قتل کر ڈالا اور مختصر مدت کے بعد خود بھی قتل ہو گیا، متوکل بہت ہی بد سرشت اور خبیث انسان تھا، وہ عیش و نشاط میں بدمست رہتا تھا اور حضرت علیؑ کی اہانت کیا کرتا تھا۔ منقول ہے کہ منتصر نے اپنے باپ کو دیکھا کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کو برا بھلا کہہ رہا ہے اس نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ اس کی سزا کیا ہے؟ بزرگ نے جواب دیا کہ اس کا قتل واجب ہے لیکن خبردار جو شخص اپنے باپ کو قتل کرتا ہے اس کی عمر کم ہو جاتی ہے۔ منتصر نے کہا: مجھے اس بات کی پروا نہیں ہے کہ

خدا کی راہ میں میری عمر کم ہو جائے چنانچہ اس نے اپنے باپ کو قتل کر دیا اور سات ماہ کے بعد خود بھی قتل ہو گیا [۱]

اس بنا پر مادی دنیا میں بھی انسان کے اعمال کے اثرات مترتب ہوتے ہیں اور اپنے عمل کا یہیں نتیجہ دیکھ لیتا ہے۔

آخرت میں انسان کے عمل کا نتیجہ

آخرت میں انسان کو جزا و سزا کے عنوان سے جو کچھ ملے گا وہ خود اس کے عمل کا تجسّم ہوگا :

یوم تجد کلّ نفس ما عملت من خیر محضراً و ما عملت من سوء تودّ لو انّ بینہا وبینہ امداً بعیداً [۲]

جس دن ہر شخص جو کچھ اس نے نیکی کی ہے اور جو کچھ بدی ہے اس کو موجود پائے گا اور آرزو کرے گا کہ اے کاش اس کی بدی اور اس کے درمیان طویل مدت حائل ہو جاتی۔

۱؎ بحار الانوار ج ۱۰ ص ۲۹۶

۲؎ آل عمران / ۳۰

یومئذ یصدر النّاس
اشتاتا لیروا اعمالھم
فمن یعمل مثقال ذرۃ
خیراً یرہ ومن یعمل
مثقال ذرّۃ شرا یرہ[1]

"جس دن لوگ گروہ گروہ نکلیں گے۔ تاکہ اعمال کی نمائشگاہ میں اپنے اعمال کو دیکھ لیں۔ پس جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔"

پس دوسری دنیا میں جو سزا ہے وہ خود اپنے اعمال کا مجسم ہونا ہے وہاں کی جزا و سزا ہی نیک و بد اعمال ہیں، جب آنکھوں سے پردے ہٹ جائیں گے وہ مجسم ہو کر سامنے آئیں گے، تلاوت قرآن خوبصورت چہرہ میں سامنے آئے گی اور غیبت اور لوگوں کو رنج پہنچانا جہنم کے کتوں کی غذا کی صورت میں بدجائے گا۔

ہمارے اعمال کی صورت مادی اور ملکی ہیں جو کہ وقتی اور فانی ہیں جیسے اس دنیا میں کوئی بات کہی تو وہ کلام کی صورت میں آشکار ہوتی ہے۔ اعمال کی صورت کا دوسرا پہلو ملکوتی ہے کہ جہاں عمل ہم سے سرزد

---

[1] زلزال / ۷ و ۸

ہونے کے بعد فنا نہیں ہوتا ہے ۔ ہمارے اعمال اسی ملکوتی چہرہ کی شکل میں باقی رہتے ہیں، آخر کار ہم ان اعمال کو دیکھیں گے اور انھیں اسی صورت میں ملاحظہ کریں گے ۔

ایک پستہ قد عورت کوئی سوال پوچھنے کے لئے پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی ۔ اس کے جانے کے بعد عائشہ نے پستہ قد بن کر اس کی نقل کی ۔ پیغمبرؐ نے فرمایا: خلال کرو ۔ عائشہ نے کہا: کیا میں نے کوئی چیز کھائی ہے آنحضرتؐ نے فرمایا: خلال کرو، عائشہ نے خلال کیا تو ان کے منھ سے ایک گوشت کا ریشہ نکلا ۔

درحقیقت پیغمبرؐ نے اپنی ملکوتی طاقت استعمال کر کے عائشہ کو اس دنیا میں ملکوتی و اخروی غیبت کی حقیقت دکھلا دی تھی[1]

رسولؐ کے صحابی قیس ابن عاصم کہتے ہیں: ایک روز ہم بنی تمیم کے ایک گروہ کے ساتھ رسول خداؐ کی خدمت میں شرفیاب ہوئے ۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! ہم صحرا میں زندگی گذارتے ہیں اور آپ کے فیض سے بہت کم مستفید ہوتے ہیں: ہمیں کچھ نصیحت فرمایئے ۔ رسولؐ نے بہت ہی گراں مایہ نصیحت فرمائی ان میں سے بعض یہ ہیں:

"ضرور تمہارا ایک ہم نشین ہوگا جو تم سے کبھی جدا نہ ہوگا یہاں تک وہ تمہارے ساتھ دفن بھی ہوگا اور جب تم مردہ ہوگے

---

[1] بحار الانوار / ج ۱۵ ص ۱۸۸

تو وہ زندہ رہے گا۔ اگر تمہارا یہ ہم نشین شریف و شائستہ ہوگا تو تمہیں عزت بخشے گا اور اگر ناشائستہ ہوگا تو تمہیں حوادث کے حوالہ کر دے گا۔ اس کے بعد تمہارے ساتھ محشور ہوگا اور قیامت کے دن تمہارے ساتھ اٹھے گا اور تم اس کے جواب دہ ہوگے پس جس ہم نشین کو تم نے اختیار کیا ہے اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو تاکہ وہ بھی نیک رہے کیونکہ اگر وہ نیک ہوگا تو تمہارے لئے باعث مسرت ہوگا ورنہ خوف دہشت کا باعث بنے گا اور وہ ہم نشین تمہارا کردار و عمل ہے۔[1]"

اس سلسلے میں سعدی کہتے ہیں:

خرما نتوان خورد ازاین خار کہ کشتیم ٭ دیبا نتوان کرد ازین پشم کہ رشتیم
بر حرف معاصی خط عذری نکشیدیم ٭ پہلوی کبائر حسناتی ننوشتیم
پیری و جوانی پی ہم چون شب و روزند ٭ ما شب شد و روز آمد و بیدار نگشتیم
چون مرغ براین کنگرہ تا کی بتوان خواند ٭ یک روز نگہ کن کہ برین کنگرہ خشتیم
ما را عجب از پشت و پناہی بود آنروز ٭ کامروز کسی را نہ پناہیم و نہ پشتیم
گر خواجہ شفاعت نکند روز قیامت ٭ شاید کہ ز مشاطہ نرنجیم کہ زشتیم
باشد کہ عنایت برسد ورنہ مپندار ٭ با این عمل دوزخیان کاہل بہشتیم

---

[1] خصال صدوق باب ثلثہ شمارہ ۸۱

"یہ کانٹے جو ہم نے بوئے ہیں ان سے ہم خرما نہیں کھا سکتے ۔ یہ اون جو ہم نے کاتا ہے اس کو دیبا نہیں بنایا جا سکتا ۔ ہم نے معصیتوں پر عذر کا خط نہیں کھینچا ہے اور گناہ کبیرہ کے پہلو میں ایک نیکی بھی نہیں لکھی ہے ۔ جوانی اور بڑھاپا ایسا ہی ہے جیسے ہمارے شب و روز آفتاب طلوع ہو گیا اور ہم سوتے ہی رہے اس محل پر مرغ کب تک بولتا رہے گا ایک روز یہ محل خاک میں مل جائے گا ۔ اس روز ہمارا کون پشت و پناہ ہو گا جب کہ آج ہم کسی کے پشت و پناہ نہیں ہیں ۔ اگر روز قیامت رسول خدا[ؐ] شفاعت نہیں کریں گے تو ہمیں جہنم میں پھینکے جانے کا افسوس نہیں ہونا چاہئے ، کیونکہ ہم برے ہیں ۔ اگر ہماری طرف چشم عنایت ہو گئی تو خیر ورنہ ہمیں دوزخیوں کے عمل پر خود کو اہل بہشت نہیں سمجھنا چاہئے ۔"

① دنیا و آخرت کا ایک فرق یہ ہے کہ وہاں انسان کے عمل کا نتیجہ ظاہر ہوگا۔ یہ نتائج تین صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں : وقتی، طبیعی و تکوینی، اخروی جزا و سزا۔

② دنیا میں انسان کے عمل کا نتیجہ جزا کی صورت ملتا ہے وہ وقتی جزا و سزا ہے جو کہ انسانی معاشروں میں رائج ہے دوسرا وضعی اثر اور طبیعی نتیجہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن دوسری دنیا (قیامت)، میں خود عمل مجسم ہو کر سامنے آئیں گے۔

① انسان کے عمل کے نتائج کس طرح ظاہر ہوتے ہیں ؟

② وقتی و اعتباری جزا و سزا کی وضاحت کیجئے۔

③ عمل کے وضعی اثر اور اس کے طبیعی نتیجہ کی تشریح کیجئے۔

④ تجسم عمل کا کیا مطلب ہے ؟

⑤ انسان کا عمل کس صورت میں مجسم ہوگا ؟

عمل کی قدر و قیمت

- حسن فعل و حسن فاعل
- حسن فعل اور حسن فاعل کے درمیان رابطہ
- کمیت یا کیفیت
- خلاصہ
- سوالات

عمل کی قدر و قیمت

حسن فعل و حسن فاعل

انسان جو عمل انجام دیتا ہے اور اس کا جو کردار سامنے آتا ہے وہ دو اعتبار سے باقیمت ہے ایک اس دنیا میں اس عمل کا وہ نتیجہ جو کہ انسانی معاشرہ پر اثر انداز ہوتا ہے اور دوسرا وہ اثر جو کہ انسان کی روح کو متاثر کرتا ہے اور جن محرکات نے انسان کو عمل کرنے پر ابھارا تھا۔ اب ہم اس موضوع پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں کہ اس عمل کے معاشرہ پر کیا منفی و مثبت شائستہ و ناشائستہ اثرات مترتب ہوئے ہیں اور ان آثار کی شعاعوں میں کتنا نور تھا۔ دوسری طرف ہم اس مطلب کو بھی کشف کرنا چاہتے ہیں کہ اس عمل کو انجام دینے کا مقصد کیا تھا اور کس ہدف کے تحت انجام پذیر ہوا تھا۔ اس توضیح سے معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے ایک عمل ایک اعتبار سے خوب اور پسندیدہ ہو اور دوسرے اعتبار سے ناشائستہ و ناپسندیدہ ہو یا اس میں نیک و بد دونوں پہلو پائے جائیں اور ناشائستہ ہو، انسان کے کام اثر کے مطابق مفید و مضر ہوتے ہیں وہ معاشرے میں شہرت پاتے ہیں اور کبھی کبھی تاریخ میں ثبت ہو جاتے ہیں۔ لوگ اس کے فعل کا تجزیہ اور فیصلہ کرنے کے بعد یا اس کی ستائش کرتے ہیں یا مذمت کرتے ہیں لیکن عمل کو انجام دینے والے

کی نظر میں جو مقصد تھا اور اس کے قلب و روح میں جس نتیجہ کی امید تھی وہ صرف عالم ملکوت میں واضح ہوگا۔

اس بنا پر حسن عمل یعنی دنیا اور معاشرہ پر اس عمل کے اثر کی قدر و قیمت اور حسن فاعلی یعنی اس کے محرک اور مقصد کے لحاظ سے عمل کی قدر و قیمت ہوگی

حسن فعل اور حسن فاعلی کے درمیان رابطہ

ایسا نہیں ہے کہ حسن فعل اور حسن فاعلی کا حساب کلی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہے اور اگر انسان معنوی لحاظ سے ترقی کرنا چاہتا ہے تو اسے گوشۂ تنہائی اختیار کرنا پڑے گا اور معاشرہ سے علیحدگی اختیار کرنا ہوگی ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ معنوی ارتقا کے لئے معاشرہ کی ذمہ داری اور تاریخی مسؤلیت کو بڑی جد و جہد سے انجام دینا ہوگا۔ لیکن اجتماعی مفید کام اس کے روحانی ارتقا پر اسی وقت مثبت اثر چھوڑے گا جب روح اس عمل کی انجام دہی سے معنوی سیر انجام دے گی۔ خود خواہی ہوس رانی سے جدا ہوگی اور اخلاص کا راستہ اختیار کرے گی۔

حسن فعلی کا حسن فاعلی سے وہی رابطہ ہے جو بدن کا روح سے ہے ایک ذی حیات روح و بدن سے مرکب ہے، حسن فعلی رکھنے والے عملی پیکر میں حسن فاعلی کو بھی پیدا ہونا چاہئے تاکہ وہ عمل زندہ ہوجائے اور رمز حیات کو پالے نیک کام کو خدائی محرک کے تحت سے انجام دینا چاہئے تاکہ انجام دینے والا بھی معنوی ترقی حاصل کرسکے اور معاشرہ بھی اس سے

بہرہ مند ہو سکے۔

الٰہی اور بشری قوانین میں ایک بنیادی فرق یہی ہے کہ الٰہی قوانین میں دو پہلو ہوتے ہیں جبکہ بشری قوانین کو بشر کے روحانی و معنوی ارتقاء سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ جس وقت کوئی حکومت اپنے ملک کی اقتصادی صورت حال کو صحیح کرنے کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو اس وقت اس کا مقصد صرف پیسہ جمع کرنا اور ملک کے بجٹ کو صحیح کرنا ہوتا ہے، حکومت کو پیسہ جمع کرنے والے کی نیت اور محرک سے کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے۔ کیا دینے والا بہ رضا و رغبت حکومت کو پیسہ دیتا ہے یا حکومت کے ڈر سے تاوان بھرتا ہے؛ حکومت کا مقصد صرف پیسہ ہے۔ چاہے مالی ٹیکس ادا کرنے والا دل ہی دل میں حکومت کو گالی دے رہا ہو لیکن حکومت اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔

اسی طرح جب حکومت ملک سے دفاع کے لئے فوج کو پرچم کے نیچے جمع کرتی ہے اس وقت بھی حکومت کو فوجیوں اور سپاہیوں کی نیت سے سروکار نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دشمن سے جنگ اور مقابلہ کرے حکومت کے لئے اس میں کوئی فرق نہیں ہوتا کہ سپاہی بہ رضا و رغبت جنگ کر رہا ہے یا قانون کے ڈر سے تا اس کی جنگ خودنمائی کی وجہ سے ہے یا احمقانہ تعصب کی بنا پر ہے یا حق و حقیقت سے دفاع کے تحت۔

لیکن الٰہی قوانین ایسے نہیں ہیں۔ یہاں۔ تو مالی ٹیکس ادا کرنے والے

سپاہی کے دل میں خلوص ہونا چاہیئے، اسلام وہ عمل چاہتا ہے جو روح کے ساتھ انجام پذیر ہو۔ اگر کوئی ریا کے تحت زکوٰۃ ادا کرتا ہے تو قابل قبول نہیں ہے اگر خودنمائی کی وجہ سے جہاد پر جاتا ہے تو قابل قبول نہیں ہے۔ مکتب الٰہی اس سپاہی کو چاہتا ہے جو دل وجان سے سپاہی ہو جس غازی نے ندائے انّ اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بانّ لھم الجنۃ[1] کو قبول کیا ہے اور یہ آیت قل ھل تربّصون بنا الّا احدی الحسنیین[2] اس کا نعرہ ہے۔

رسول خدا کا ارشاد ہے:

انّما الاعمال بالنّیات[3]

نیت روح عمل ہے اور عمل کی قدر وقیمت کا دارومدار نیت پر ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے آدمیت کی شریف روح کی وجہ سے آدمی کا تن بھی شریف ہوجاتا ہے۔ اس کے عمل کی شرافت بھی اس کی روح کی وجہ سے ہے اور عمل کی روح اخلاص ہے:

وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین بیّنہ/۵

---

[1] توبہ/۱۱۱ (بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کے جان ومال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے)

[2] توبہ/۵۲ (کہہ دیجئے کہ تم ہمارے بارے میں جس بات کا انتظار کر رہے ہو وہ دو میں سے ایک نیکی ہے)

[3] بحار الانوار ج/۷۰ ص۲۱۱

"اس کے سوا انھیں کوئی حکم نہیں دیا گیا ہے کہ وہ مخلصانہ طور پر خدا کی عبادت کریں۔"

کمیت یا کیفیت

گزشتہ بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا کے نزدیک اور ملکوتی دفتر میں جس عمل کی قدر و قیمت ہے وہ عمل کی کیفیت ہے کمیت نہیں! اس نکتہ پر توجہ نہ کرنے کی وجہ سے سادہ لوح افراد نے اولیائے خدا کے بعض بہت ہی بلند کارناموں کو تھوڑا سمجھ کر افسانے گڑھ ڈالیں ہیں۔

مثلاً، حضرت علیؑ کی اس انگوٹھی کے بارے میں جو آپ نے رکوع کی حالت میں سائل کو دی تھی، اور اس سلسلہ میں آیت نازل ہوئی تھی، بعض لوگوں نے کہا ہے: اس انگوٹھی کی قیمت شام، اس کے متعلقہ علاقوں کے خراج کے برابر تھی چنانچہ لوگوں کو یہ بات باور کرانے کی وجہ سے اسے روایت کی شکل دیدی ہے۔

ان کے لحاظ سے یہ بات تعجب خیز تھی کہ ایک چھوٹی سی انگوٹھی کیلئے مبداوحی سے ایک عظیم آیت نازل ہو اس لئے انہوں نے افسانہ تیار کیا اور اس کی مادی قیمت بڑھادی ان لوگوں نے اس بات پر توجہ نہ کی جس انگوٹھی کی قیمت شام اور اس کے متعلقہ علاقوں کے خراج کے برابر ہوگی وہ مدینہ ایسے فقر زدہ شہر میں علی کے دست مبارک میں کیونکر ہو سکتی ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت علیؑ کے دست مبارک میں ایسی

انگوٹھی تھی تو بھی آپ اسے ایک ہی فقیر کو نہیں دے سکتے تھے بلکہ اس انگوٹھی کی قیمت سے ایک شہر آباد کرتے اور تمام شہر والوں کے فقر و افلاس کو دور کر دیتے۔

شاید یہ لوگ ان نان جویں کے بارے میں جو کہ حضرت علیؑ اور آپ کے اہل و عیال نے راہ خدا میں دیدی تھیں اور سورہ "ھل اتی" ان کی شان میں نازل ہوا تھا۔ یہ کہیں گے کہ وہ جو کی نہیں بلکہ سونے کی روٹیاں تھیں، ہرگز ایسا نہیں ہے۔ بلکہ علیؑ کے خلوص نے ان کی قدر و قیمت بڑھائی تھی جو چیز عمل کی قیمت و اہمیت میں اضافہ کرتی ہے۔ اس کی طرف قرآن نے اس طرح اشارہ کیا ہے:

انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاء و لا شکوراً [1]

"ہم صرف خدا کی خاطر کھانا دیتے ہیں تم سے کسی جزاء اور شکریہ کے طلب گار نہیں ہیں۔"

اس کے علاوہ بھی حضرت علیؑ کی زندگی میں ایسی بہت سی مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں اور ان سے خلوص عمل کا طریقہ سیکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ روز خندق آپؑ کی وہ ضربت جو پیکر کفر پر پڑی تھی وہ دونوں جہاں اور جو کچھ ان میں ہے ان سب سے افضل ہے۔

---

[1] انسان / ۹

اسی لئے تو قرآن کی نظروں میں کافروں کا عمل بے حقیقت اور سراب کی مانند ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پر ان کے اعمال آراستہ اور پرکشش ہوتے ہیں لیکن پست اور مادی مقاصد کے تحت انجام دیئے جاتے ہیں اس لئے ان میں ملکوتی جھلک نہیں ہوتی ہے۔

خلاصہ

۱. جو عمل بھی انسان انجام دیتا ہے وہ دو اعتبار سے قابل توجہ ہے: ۱۔ نتیجہ اور اثر کے لحاظ سے کہ جس کا تعلق معاشرہ سے ہوتا ہے ۲۔ وہ محرکات و عوامل جو کہ انجام دینے والے کے قلب میں موجود تھے۔

۲. حسن فعلی اور حسن فاعلی کے درمیان وہی نسبت ہے جو روح اور بدن کے درمیان ہے۔ جس طرح روح کی وجہ سے آدمی کا تن بدن شریف ہوتا ہے اسی طرح اس کا عمل بھی روح کی وجہ سے بلند ہوتا ہے اور عمل کی روح اخلاص ہے۔

۳. اس بحث سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ملکوتی دفتروں میں جو چیز عمل کی قدر و قیمت بڑھاتی ہے وہ عمل کی کیفیت ہے کمیت نہیں۔ اور اخلاص اس کیمیا کی مانند ہے جس کو کسی بھی عمل پر چڑھا کر بیش بہا بنایا جا سکتا ہر چند وہ کمیت کے اعتبار سے کم ہی کیوں نہ ہو۔

سوالات

۱. حسن فعلی اور حسن فاعلی کی تعریف بیان کیجئے۔
۲. حسن فعلی اور حسن فاعلی کے درمیان کیا رابطہ ہے۔
۳. الٰہی قوانین اور بشری قوانین کے درمیان بنیادی فرق کی وضاحت کیجئے
۴. الٰہی دفتر میں عمل کی قدر و قیمت کا معیار کیا ہے؟
۵. اخلاص کی وضاحت کیجئے۔

قیامت کا حال

- اعمال کی کسوٹی
- نامۂ اعمال کی پرکھ کا ذریعہ
- نامۂ اعمال
- قیامت میں لوگوں کی جماعتیں
- خلاصہ
- سوالات

قیامت کا حال

اعمال کی کسوٹی

قیامت کا ایک نام "یوم الحساب" ہے کیونکہ روز قیامت حساب وکتاب ہوگا، اس روز سارے انسان قطعی فیصلے کے لئے عدالت الٰہیہ میں حاضر ہوں گے اور ان کے عقائد و اعمال کا حساب ہوگا اور اس حساب و کتاب کے نتیجہ میں اپنے اعمال کی جزاء و سزا پائیں گے۔

ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ فلا تظلم نفس شیئاً وان کان مثقال حبۃ من خردل اتینا بھا وکفیٰ بنا حاسبین[1]

"اور ہم روز قیامت عدل کا ترازو قائم کردیں گے اور کسی نفس پر ذرہ برابر بھی ظلم نہ کیا جائے گا اور اگر اس کا عمل رائی کے دانہ کے برابر ہوگا تو ہم اس کا بھی حساب کریں گے۔ صرف

---

[1] انبیاء/ ۴۷

ہمارا علم حساب کے لئے کافی ہوگا۔

اعمال کی پرکھ کا ذریعہ

اعمال کو کس چیز سے تولا جائے گا؟ انسانوں کے اعمال کی قدر و قیمت کا اندازہ کس چیز سے کیا جائے گا؟ امام جعفر صادقؑ سے ہشام نے اعمال کو تولنے والے اس ترازو کے بارے میں دریافت کیا جو کہ آیت میں وارد ہوا ہے، آپؑ نے فرمایا: انبیاء و اوصیا میزان ہیں۔ چنانچہ امیرالمؤمنین کی زیارت میں ہے: "السلام علیٰ میزان الاعمال" سلام ہو اس پر جو اعمال کی کسوٹی ہے۔

اس بنا پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کامل انسان ایسے نمونے ہیں جو کہ انسانوں کے اعمال کی پرکھ کی کسوٹی بن جاتے ہیں۔ چنانچہ دنیا میں بھی لوگ ان نمونوں پر اپنے اعمال کو پرکھ کر دیکھ سکتے ہیں اور ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

آخرت کے میزان، حق و عدالت کے میزان ہیں، ان میں صرف ان اعمال کو تولا جائے گا جو کہ حقیقت پر مبنی ہوں گے۔ اور مخلصانہ نیت سے انجام پذیر ہوئے ہوں گے اور اخلاص کی روح سے زندہ ہوئے ہوں گے۔ ان میزانوں میں ان مخلصانہ اعمال کا وزن ہوگا جن کی اخروی اور حقیقی قدر و قیمت ہوگی، وزن نیکیوں میں ہے اور ہلکا پن بدی میں ہے جو امور شر و ریا کی وجہ سے باطل کے رنگ میں رنگ گئے ہیں ان کا کوئی وزن نہیں ہے

اور نہ وہ اپنے انجام دینے والوں کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

والوزن یومئذ الحق فمن ثقلت
موازینہ فاولئک الذین خسروا
انفسھم بما کانوا بایاتنا یظلمون۔[۱]

اس روز اعمال کا تولا جانا حق ہے پس جس کے اعمال کا پلہ بھاری ہوگا وہ کامیاب ہیں اور جس کے اعمال کا پلہ ہلکا ہوگا انہوں نے خود کو تباہ کیا ہے کیونکہ وہ ہماری آیتوں کے سلسلہ میں ظالم تھے۔

نامۂ اعمال

قرآن کی آیتوں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس دنیا میں انسان کے گفتار و کردار کو خدا کے فرشتے لکھتے ہیں اور ہر چھوٹا، بڑا کام قلم بند ہوتا ہے اور قیامت کے دن سب انسان کے سامنے پیش کر دیئے جائیں گے۔ جس وقت جرائم پیشہ اور گنہگار اپنا نامہ اعمال دیکھیں گے تو پتھرائی ہوئی آنکھوں اور رنج و ملال کے ساتھ کہیں گے:

یا ویلتنا مالھذا الکتاب لا یغادر
صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصیھا
وجدوا ما عملوا حاضراً[۲]

---

[۲] کہف / ۴۹

وائے ہو ہم پر یہ کیسا نوشتہ ہے کہ نہ چھوٹے گناہ کو لکھے بغیر
چھوڑا ہے اور نہ بڑے کو اور اس میں سارے اعمال کو حاضر پائیں گے۔

قرآن کریم کی آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب اور نامہ اعمال سے وہ
وہ فائل مراد ہے کہ جس میں انسان کے گفتار و کردار کو محفوظ رکھا جاتا ہے،
بلکہ انسان کے اعمال اور ان کی حقیقتوں کا مجموعہ مراد ہے جو مجسم ہو کر اس کے
سامنے آئیں گے۔

وکل انسان الزمناہ طائرہ
فی عنقہ ونخرج لہ یوم
القیامۃ کتابا یلقیہ منشورا
اقرا کتابک کفی بنفسک الیوم
حسیبا۔[1]

اور ہم نے ہر انسان کے نامہ اعمال کو اس کے گلے کا ہار بنا دیا
ہے اور روز قیامت اسے اس کے سامنے رکھ دیں گے جسے
وہ کھلی کتاب کی طرح دیکھے گا۔ اور کہا جائے گا۔ اپنی
کتاب کو پڑھو آج اپنے حساب کے لئے تم خود ہی کافی ہو۔

قیامت میں لوگوں کی جماعتیں

قرآن مجید روز قیامت لوگوں کی تین قسمیں بیان کرتا ہے۔ ایک گروہ ان لوگوں

---

[1] اسراء/ ۱۳ و ۱۴

کا ہے کہ جن کی روح ہر قسم کی آلودگی سے پاک اور پاکیزہ پیکر میں ہونے کے سبب بلند و بالا مرتبہ پر فائز ہوں گے یہ مخلصوں کا گروہ ہے جو کہ شیطانی وسوسوں اور نفسانی ہوس سے محفوظ تھا اور ابلیس انھیں فریب دینے سے عاجز ہے یہ سابقین کا گروہ ہے کیونکہ یہ اپنے کامل اخلاص اور پاکیزگی و طہارت کی بنا پر روز محشر تمام مشکلات سے مستثنیٰ ہوں گے، یہ بارگاہ الٰہی میں مقرب ہیں اور اس کی نعمتوں سے ہمیشہ سرشار رہتے ہیں۔

والسابقون السابقون اولئک
المقربون فی جنات النعیم[1]

اور جنہوں نے سبقت کی وہ بارگاہ خدا میں مقرب ہیں نعمتوں والی بہشت میں ہیں۔

دوسرا گروہ اصحاب یمین کا ہے جن کے داہنے ہاتھ میں نامہ اعمال دیا جائے گا نیک کاموں اور ایمان کی بنا پر ان کا حساب آسان ہوگا اور خوشی و مسرت کی حالت میں اپنے نامہ اعمال کو دیکھتے ہوں گے اور دوسروں کو دکھائیں گے۔

فاما من اوتی کتابہ بیمینہ فسوف
یحاسب حسابا یسیرا و ینقلب
الیٰ اھلہ مسرورا۔[2]

---

[1] واقعہ/ ۱۰ تا ۱۲

[2] انشقاق/ ۷۔ ۹

پس جس کا نامہ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب آسان طریقہ سے لیا جائے گا اور پھر وہ اپنے عزیزوں کی طرف خوشی خوشی جائے گا۔

تیسرا گروہ ان بدبختوں کا ہے کہ جن کا نامہ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اسی لئے ان "اصحاب الشمال" کہا جاتا ہے جیسے ہی انھیں نامہ اعمال ملے گا یہ خوف زدہ ہو جائیں گے اور اس آگ میں جلیں گے جس کو انہوں نے خود روشن کیا ہے کیونکہ انہوں نے دنیا میں حق والوں کی اور ہدایت یافتہ افراد کی تکذیب کی ہے، "الضالون المکذبون" اسی لئے ان کے سارے اعمال باطل اور بے قیمت ہیں اور آخرت کے میزان میں سبک و ہلکے ہیں:

"فاما من اوتی کتابہ بشمالہ فیقول یالیتنی لم اوت کتابیہ ولم ادر ماحسابیہ"

"لیکن جس کے بائیں ہاتھ اس کا نامہ اعمال دیا جائے گا وہ کہے گا اے کاش میرا نامہ اعمال مجھے نہ دیا ہوتا اور میں اپنے حساب سے آگاہ نہ ہوتا۔"

ـــ الحاقہ / ۲۵

خلاصہ

۱. روز قیامت حساب کا دن ہے اور لوگ اس دن قطعی فیصلہ کے لئے خدا کی عدالت میں حاضر ہوں گے اور اپنے اعمال کا وزن دیکھیں گے۔ صرف مخلصانہ کام آخرت کے میزان میں باوزن ہوں گے اور خلوص سے خالی اعمال سبک اور ہلکے ہوں گے۔

۲. نامہ اعمال سے مراد کوئی فائل نہیں ہے کہ جس میں ریکارڈ موجود ہو انسان کے اعمال کی حقیقت مراد ہے جو کہ مجسم ہو کر اس کے سامنے آئے گی۔

۳. قرآن کی آیات قیامت میں لوگوں کی تین قسمیں بیان کرتی ہیں "سابقون" جو کہ بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے، "اصحاب الیمین" جن کا آسان حساب ہوگا۔ "اصحاب الشمال" جو اپنا نامۂ اعمال لیتے ہی ملول ہو جائیں گے۔

۱. روز قیامت کو روز حساب کیوں کہا گیا ہے؟

۲. اعمال کو تولنے کا ترازو کیا ہے؟

۳. اعمال نامہ سے کیا مراد ہے۔

۴. سابقون کون لوگ ہیں اور قیامت میں لوگوں کے کتنے گروہ ہوں گے؟

۵. اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کون ہیں؟

منزل جاویدان کی طرف

- فراق کا دن
- حسرت کا دن
- دائمی ٹھکانہ

منزل جاویداں کی طرف

فراق کا دن

قیامت کا ایک نام "یوم الفصل" روز فراق ہے جو دنیا و آخرت کے فرق کو بیان کرتا ہے، کیونکہ دنیا میں سارے انسانوں کی زندگی اجتماعی تھی چند افراد کوئی کام کرتے تھے۔ اس سے سارے انسان فائدہ اٹھا سکتے تھے جبکہ آخرت میں سب اپنا اپنا بوجھ اٹھائیں گے کوئی کسی کا بار نہیں اٹھائے گا۔

لن تنفعکم ارحامکم ولا اولادکم
یوم القیامۃ یفصل بینکم
"واللہ بما تعملون بصیر [1]

قیامت کے دن نہ تمہارے عزیز کام آئیں گے نہ تمہاری اولاد اس دن تمہارے درمیان جدائی ڈال دی جائے گی اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے اچھی طرح واقف ہے۔"

---

[1] ممتحنہ / ۳

دوسرے یہ کہ دنیا میں نیک و بد ایک ہی جگہ زندگی گذارتے ہیں لیکن آخرت میں سب کا حساب ہو چکنے کے بعد نیک و بد جدا ہو جائیں گے مومنین ایک طرف اور منافقین دوسری طرف چلے جائیں گے۔

وامتازوا الیوم ایھا المجرمون[1]

گنہگارو! آج جدا ہو جاؤ

حسرت کا دن

جنہوں نے دنیوی زندگی میں صرف حق کا دامن تھامے رکھا وہ اس روز خدا کی بارگاہ میں خنداں و خوشحال ہوں گے اور جنت کی نعمتیں ان کے لئے تیار ہوں گی لیکن گناہگار کہ جنہوں نے اپنی عمر ظلم و ستم اور مادی و پست مقاصد حاصل کرنے اور معصیت میں گذاری ہے اور روح کو گناہ سے آلودہ کر لیا ہے وہ شرمسار اور غمگین ہوں گے، ندامت سے سر جھکے ہوئے اور خدا کی نعمتوں سے محروم ہوں گے۔

اس وقت ذلت کی خاک سے ان کے چہرے اٹے ہوں گے اور حسرت کی آگ سے دل کباب ہوں گے اور یہ آرزو کرتے ہوں گے اے کاش ہم خاک ہوتے اور یہ صورت حال نہ دیکھتے۔

و یقول الکافر یالیتنی کنت ترابا[2]

کافر کہے گا اے کاش میں خاک ہوتا۔

---

[2] نبا/۴۰

دائمی ٹھکانہ

خداوند عالم مومنوں اور نیکو کاروں کو بہشت بریں میں ہمیشہ کے لئے جگہ مرحمت فرمائے گا اور گناہگاروں اور جرائم پیشہ لوگوں کو جہنّم کے دردناک عذاب میں داخل کرے گا کہ جس کا وعدہ کر رکھا ہے۔ قرآن مجید نے جنت وجہنّم کی بہت سی خصوصیات بیان کی ہیں اور متعدد مقامات پر ان کی توصیف کی ہے۔ لیکن ان تمام بہترین و عام فہم توصیفات کے باوجود ان دونوں میں بنیادی فرق ہے جنھیں ہم ایسے اس سرائے فانی میں زندگی گذارنے والے نہیں سمجھ سکتے ہیں۔

عالم آخرت میں جو وسیع لذتیں اور رنج والم ہیں انھیں صرف ان خصوصیات کے ذریعہ کامل طور پر نہیں پہچانا جا سکتا اور نہ اس کی حقیقت کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔

جنّت اور اس کی وسیع و بے پناہ نعمتوں کی توصیف ایسی ہی ہے جیسے ایک ماں اپنے اس بیٹے کو جو کہ ابھی شکم ہے دنیوی لذتوں اور اس کی جنت آگیں وادیوں کے بارے میں بتائے اور اس کی وسعتوں کا تذکرہ کرے۔

جس بچے نے بہتے ہوئے چشمے نہ دیکھے ہوں، لالہ و نسرین کے بارے میں کوئی غزل نہ سنی ہو اور طلوع آفتاب کا دل فریب منظر نہ دیکھا ہو کیا وہ ان حسین مناظر کو بیان کر سکتا ہے؟ جنت کی نعمتوں کی توصیف

اور اس کی دل آویز رعنایاں اور اس دنیا کی لذتیں ہم ایسے مادی زندگی گذارنے والوں کے لئے ایسی ہی ہے۔

قرآن مجید جنت کی بے پناہ نعمتوں کو بیان کرتا ہے، وہاں انسان کو جس چیز کی خواہش ہو گی وہ حاضر ہو جائے گی گھنے باغوں میں آراستہ اور فلک بوس محل اور ان کے نیچے صاف و شفاف اور خوشگوار بہتے ہوئے چشمے۔

جنت کے درختوں کے میوے دائمی ہیں۔ گھنے درخت ہیں، ان کے میووں کا چننا آسان ہے۔ وہاں نہ گرمی ہے نہ سردی۔ ضرورت کی ہر چیز وہاں موجود ہے جس چیز کو دیکھنے سے لذت حاصل ہوتی ہے وہ وہاں موجود ہے۔ دل لبھانے والی اور تازہ ہوائیں چلتی ہیں، اس کا پانی کبھی گدلا نہیں ہوتا۔ ان نہروں کے پانی کا ذائقہ کبھی متغیر نہیں ہوتا۔ وہاں کے باشندوں کے دل کینہ و عداوت سے پاک ہیں، ان میں اخوت وصفا کی حکمرانی ہے۔ ان پر سستی اور کاہلیت طاری نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ جنت میں رہتے ہیں۔[1]

لیکن یہ سب جنت کی نعمتوں کے گوشے ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ جنت میں اس کے لئے کیا کیا چیزیں آمادہ ہیں۔ فلا تعلم نفس ما اخفیٰ لھم من قرۃ اعین جزاء بما کانوا یعملون۔[2]

---

[1] رعد/۳۵، دھر/ ۱۳ و ۱۴، زخرف/ ۷۱، مطففین/ ۲۵، حجر ۴۷ و ۴۸

[2] سجدہ/ ۱۷

قرآن ان نعمتوں اور لذتوں کو شمار کرانے کے بعد ایک اعلیٰ حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کہ تمام نعمتوں سے بالاتر ہے۔

وعد اللہ المومنین والمومنات جنات
تجری من تحتھا الانہار خالدین
فیھا ومساکن طیبۃ فی جنات
عدن ورضوان من اللہ اکبر
ذٰلک ھو الفوز العظیم[1]۔

"خداوند عالم نے مومن مردوں اور مومنہ عورتوں سے ان جنتوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور جنت عدن میں ان کو پاکیزہ گھر ملیں گے اور خدا کی خوشنودی ملے گی جو کہ سب سے بڑی کامیابی ہے"

خدا کی رضا و خوشنودی کی لذت کا ادراک اور تقرب خدا ان لوگوں کو حاصل نہیں ہوگا جو کہ مادہ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور طبعی لذتوں میں گھرے ہوئے ہیں لیکن، جن لوگوں نے تہذیب نفس اور روح کی تربیت کی بدولت، خود کو مادے کے گرداب سے آزاد کر کے ، قرب خدا اور اس کی رضا کے جلوے دیکھے ہیں اور اس کے وصل وانس کا ذائقہ اپنی نمازوں میں چکھا ہے۔

---

[1] توبہ/۷۲

اسی طرح آخرت کے عذاب کا بھی اس دنیا کے رنج والم اور عذابوں سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا ہے بیشک دوزخ سرکشوں کا ٹھکانہ ہے، ہمیشہ اس میں رہیں گے وہ نہ ٹھنڈا مزہ چکھ سکیں گے اور نہ پینے کی چیز کا، ان کی غذا صرف کھولتا ہوا پانی اور پیپ ہوگی اور یہ ان کے اعمال کا مکمل بدلہ ہوگا۔"[1]

لیکن سب سے بڑا عذاب اور رنج وغم یہ ہوگا کہ وہ خدا کی رحمت اور قرب سے محروم رہیں گے۔ جن لوگوں نے کفر، عناد، ناپاکی اور غلط کاری کی وجہ سے اپنے اوپر خدا کی رحمت کے دروازے بند کرلیے ہیں اور جنہوں نے اپنی روح و قلب سے خدا کی رحمت و الطاف کو قبول کرنے والی صلاحیت کو فنا کر دیا ہے، وہ اپنے کئے ہوئے اعمال کے نتیجہ میں خدا کی رضا اور اس کے وصل کی لذتوں سے محروم رہیں گے۔ ہاں جن کے گناہ اتنے بڑے نہیں ہونگے کہ جن سے خدا کی رحمت کو قبول کرنے کی صلاحیت مفقود ہوجاتی ہے، ممکن ہے دیر یا سویر ان کے سیاہ قلب پر خدا کی رحمت کا بادل برسے اور پاک ہونے کے بعد وہ جنت میں چلے جائیں۔

جنت الخلد میں وصل وانس کی لذت ایسی ہی ہے جیسا کہ قرب خدا اور رضائے الٰہی کے حامل امیرالمؤمنین علی نے دعائے کمیل میں فرمایا ہے:

فہبنی یا الٰہی وسیدی ومولای وربی

صبرت علی عذابک فکیف اصبر علی

---

[1] نبأ، ۲۶

فراق[1] ؟

اے اللہ، مولا، میرے آقا و پروردگار، میں اس بات کو قبول کرتا ہوں کہ میں تیرے عذاب پر صبر کر لوں گا لیکن تیرے فراق اور جدائی پر کیسے صبر کرونگا۔

مدارک

۱۔ حیات اخروی

۲۔ عدل الہی

۳۔ خدا و معاد

---

[1] دعائے کمیل

۱- انسان کمال کا متلاشی ہے۔
۲- کمال انسانی ان اختیاری افعال کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں جنھیں حکم عقل کے تحت انجام دیا جاتا ہے۔
۳- عقل کے عملی احکام علوم نظری کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں، ان میں سب اہم تصور کائنات کے اصول سہ گانہ، مبداء وجود — توحید — ، زندگی کا سرانجام — معاد — کمال کے پروگرام حاصل کرنے کے لئے محفوظ ذریعہ، — نبوت — کی معرفت، ان ہی کو ہستی شناسی، انسان شناسی اور راہ شناسی کہتے ہیں۔

اب ہم تینوں مقدمات میں سے ہر ایک کی وضاحت کرتے ہیں۔

انسان کمال جو ہے :

جو بھی اپنے باطنی محرکات اور نفسیاتی میلانات کے سلسلہ میں غور کرے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ ان سے زیادہ تر میں کمال پر پہنچنے کی صلاحیت کی ہے۔ کلی طور پر کوئی شخص یہ نہیں چاہتا کہ اس کے اندر کسی قسم کا عیب یا نقص ہو، وہ کمال پر پہنچنے کے لئے جہاں تک ممکن ہوتا ہے، اپنے وجود سے نقص اور عیب کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ وہ عیوب کے برطرف ہونے تک انھیں دوسروں سے چھپائے رکھتا ہے۔

یہ میلان اگر اس کی فطری راہ کے مطابق ہوتا ہے تو ہر قسم کی مادی و معنوی ترقی کا باعث ہوتا ہے اور اگر ماحول اور اسباب کی وجہ سے غلط راستہ پر لگ جائے تو تکبر ریاکاری اور تملق پسندی ایسے صفات کا سبب بنتا ہے۔

بہر حال کمال کا رجحان ایک ایسا فطری اور قوی سبب ہے کہ جس کی جڑیں انسانی روح کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہیں۔ اس کے اثرات اکثر صاف نظر آتے ہیں اور

معمولی غور و فکر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان سب کا سرچشمہ کمال جوئی ہے

کمال انسان پیروی عقل کا رہین منت ہے:

نباتات کی نشوونما بیرونی حالات کی فراہمی کی مرہون منت ہے اور ان کا ارتقاء جبری ہے۔ کوئی بھی درخت اپنے اختیار سے رشد نہیں کرتا ہے اور نہ ہی اپنی مرضی سے پھل لگاتا ہے کیونکہ اس میں ارادہ و شعور نہیں ہے۔

جانوروں کے ارتقاء میں کم و بیش انتخاب و ارادہ کا راز تلاش کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے اس ارادہ کا سرچشمہ اندھے حیوانی غرائز اور فطری ضرورتوں کی محدود بساط ہوتی ہے اور ہر حیوان کے لئے محدود شعور و احساس اس کے جسم کے مطابق ہوتا ہے۔

لیکن انسان نباتی اور حیوانی خواص کے علاوہ دو روحانی امتیازات کا حامل ہے ایک طرف اس کی فطری خواہشات کو صرف طبیعی ضرورتوں ہی میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف اس کے پاس عقل جیسی قوت موجود ہے کہ جس کے ذریعہ وہ اپنی معلومات کو لامحدود بنا سکتا ہے اور ان خصوصیات کی بنا پر اس کے ارادہ کو مادی چیزوں میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔

بالکل اس طرح جیسے نباتات کے مخصوص کمالات، خاص نباتی قویٰ کے سبب حاصل ہوتے ہیں اور حیوانی کمالات ان ارادوں اور حسی ادراکات کے سبب حاصل ہوتے ہیں کہ جن کا منبع غرائز ہیں۔ انسان کے مخصوص کمالات درحقیقت اس کے روحی کمالات ہیں جو کہ شعور و ارادہ اور عقل کی راہنمائی سے وجود میں آتے ہیں۔ لیکن یہاں وہ عقل مراد ہے جو کہ مطلوبیت کے مختلف مراتب کو پہچانتی ہو اور ٹکراؤ کی صورت میں بہتر چیزوں کو ترجیح دیتی ہو۔

اس بنا پر، انسانی اعمال و افعال ان ہی کو کہا جائے گا جو کہ انسان کے مخصوص تمائلات سے پیدا ہونے والے ارادہ اور عقل کی ہدایت سے انجام پاتے ہوں چنانچہ جو افعال صرف حیوانی محرکات سے انجام پذیر ہوتے ہیں انھیں حیوانی افعال ہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ انسان کے بدن میں کوئی تبدیلی صرف میکانیکی طاقت سے پیدا ہو تو اسے فقط فزیکل تبدیلی کہا جاتا ہے۔

عقل کے عملی احکام مبانی نظری کے محتاج ہیں:

انسان کے اختیاری افعال کمال تک پہونچنے کا ذریعہ ہیں اور اس کی قدر و قیمت اس مقصد کے تابع ہے کہ جس کے لئے اعمال انجام دیئے گئے ہیں اور وہ تاثیر ہے جو کہ تکامل روح میں ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر اعمال ایک روحی کمال کے زوال کا سبب بنتا، تو اس کی قیمت بھی کم ہو جائے گی۔

پس عقل اس وقت اختیاری افعال کی قدر و قیمت کا فیصلہ کر سکتی ہے کہ جب وہ انسانی کمالات اور ان کے مراتب سے آگاہ ہو اور یہ بھی جانتی ہو کہ انسان کس نوعیت کا موجود ہے اور اس کی زندگی کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور وہ (انسان) کمال کے کس درجے تک رسائی حاصل کر سکتا ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے: وہ یہ جانتی ہو کہ اس کے وجود کا سرچشمہ کیا ہے اور اس کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟

اس بنا پر، صحیح آئیڈیالوجی کا حاصل کرنا ــــ یعنی اختیاری افعال پر حکم نظام ــــ صحیح تصور کائنات کا مرہون منت ہے اور یہی اس کے مسائل کا حل ہے، جب تک عقل ان مسائل کو حل نہیں کر سکتی اس وقت تک انسان کے اختیاری افعال کی قدر و قیمت کے بارے میں قطعی فیصلہ نہیں کر سکتی جیسا کہ جب تک مقصد معلوم نہ ہو اس وقت

تک اس تک رسائی کے راستے بھی معلوم و معین نہیں ہو سکتے پس یہ نظری معرفتیں چونکہ تصور کائنات کے بنیادی مسائل کو تشکیل دیتی ہیں ، درحقیقت عقل کے عملی احکام اور اس کے قیمتی نظام کی بنیاد شمار ہوتی ہیں۔

نتیجہ :

اب ہم ان مقامات کی روشنی میں دین کی تلاش اور صحیح تصور کائنات اور آئیڈیالوجی کے حصول کو اس طرح ثابت کر سکتے ہیں۔

انسان فطری طور پر اپنے انسانی کمال کا متلاشی ہے اور مختلف امور کی انجام دہی کے ذریعہ اپنے حقیقی کمال کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس بات سے واقفیت کے لئے کہ کون سے امور اسے اس کے مقصد سے قریب کرتے ہیں۔ پہلے اسے اپنے آخری مقصد کو پہچاننا چاہئے۔ اور اس کی معرفت خود اس کے حقیقت وجود سے آگہی اور اس کے آغاز و انجام کی معرفت کی رہین منت ہے۔ ان تمام مراحل کے بعد اس کے مختلف اعمال اور گوناگوں کمال کے درمیان مثبت یا منفی رابطہ کو معین کیا جا سکتا ہے تاکہ انسان اپنے ارتقاء کی صحیح راہ کو پہچان لے اور جب تک تصور کائنات کے اصول حاصل نہیں کر سکتا اس وقت تک صحیح آئیڈیالوجی کو بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔

پس دین حق کو پہچاننے کے لئے کوشش کرنا اس لئے ضروری ہے کہ جس میں صحیح تصور کائنات اور آئیڈیالوجی بھی شامل ہے۔ اور اس کے بغیر کمال انسانی تک پہنچنا ممکن نہیں ہے جیسا کہ وہ افعال بھی انسانی شمار نہیں ہوں گے کہ جن کا سرچشمہ مذکورہ اقدار و محرکات نہ ہوں۔ اور جو شخص دین کو نہیں پہچاننا چاہتا یا اسے پہچاننے

کے بعد بغض و عناد کی وجہ سے کفر اختیار کر لیتا ہے اور صرف حیوانی خواہشات اور فنا پذیر مادی لذتوں ہی کو اپنا مقصد سمجھتا ہے۔ درحقیقت وہ حیوان ہی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: یتمتعون و یاکلون کما تاکل الانعام (سورہ محمد/۱۲) "وہ چوپایوں کی طرح کھاتے ہیں اور عیش اڑاتے ہیں۔ اور چونکہ وہ اپنی انسانی صلاحیتوں کو برباد کرتے ہیں اس لئے ان کو دردناک عذاب دیا جائے گا۔

ارشاد ہے:

ذَرْهُمْ يَاْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْن

(سورہ حجر/۳)

انہیں چھوڑ دو، کھائیں پئیں اور عیش اڑائیں انہیں امید نے بہلا رکھا ہے، عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔
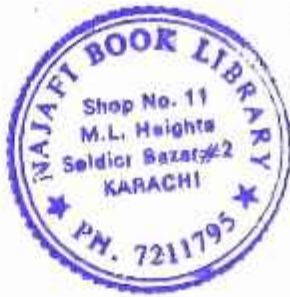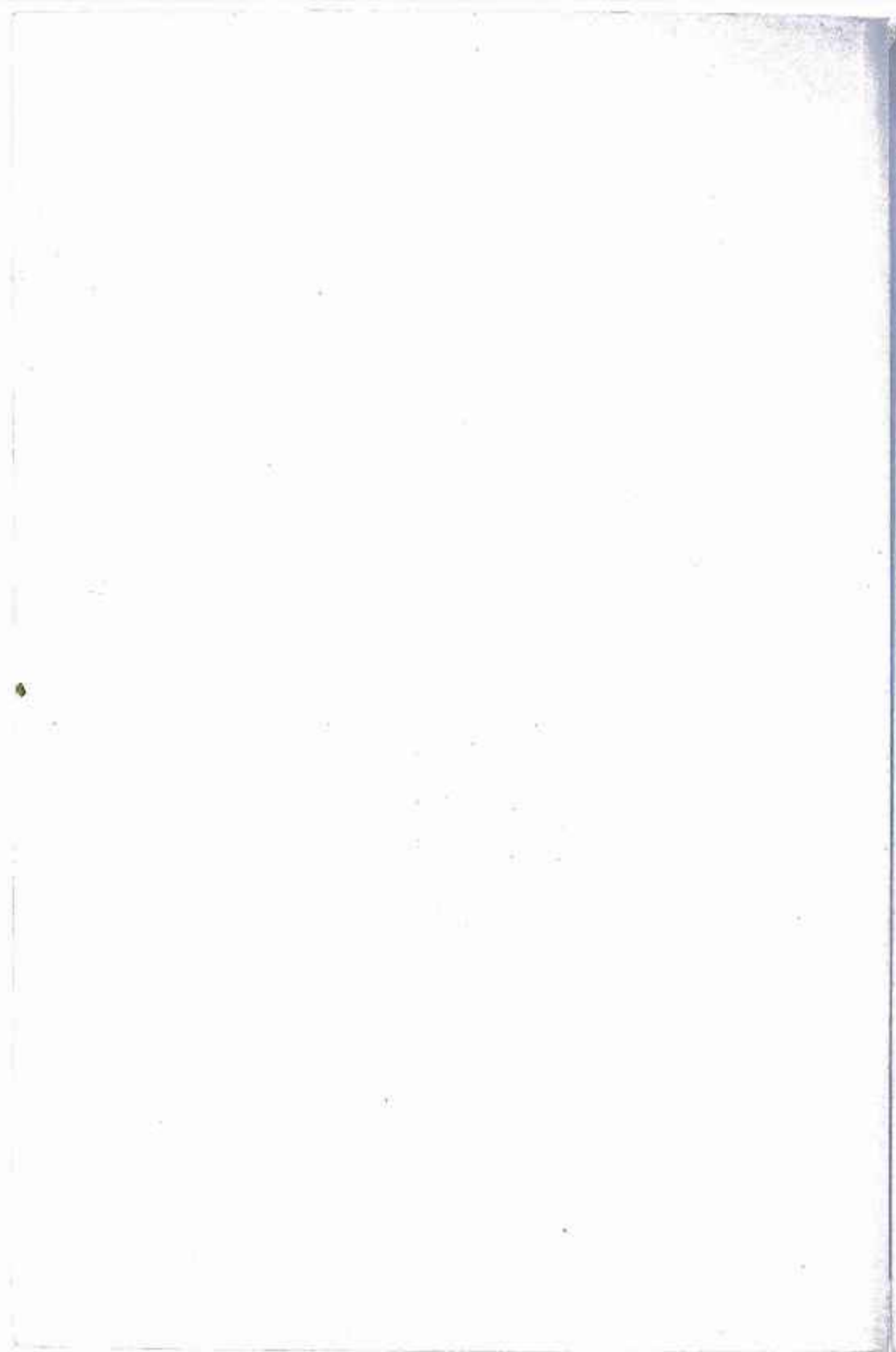
کیا وجود انسان اسی مادی بدن میں منحصر اور اس کی حیات اسی دینوی زندگی میں محدود ہے؟ یا دوسری زندگی بھی اس کا مقدر ہے؟ اگر دوسری زندگی کا ہے تو کیا دینوی حیات اور دوسری زندگی کے درمیان کوئی رابطہ ہے؟ اگر رابطہ اس زندگی کو سنوارنے کیلئے کونسے امور موثر ہیں؟ اور زندگی کے صحیح پروگرام کو پہچا کیا طریقہ ہے؟ کہ جس سے دونوں جہان کی زندگی سنور جائے،

یہ کتاب ان اور ایسے ہی بہت سے سوالات کا مکمل و مستدل جواب پیش کرتی ہے،

انصاریان پبلیکیشنز

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۷

قم۔ جمہوری اسلامی ایران

فون نمبر: ۷۷۴۱۷۴۴ فیکس نمبر: ۰۰۹۸_۲۵۱_۷۷۴۴۶۴۷

Email:ansarian@noornet.net

www.ansariyan.org & www.ansariyan.net